اسلامی علوم و تحقیقات اور زبان و ادب کا ترجمان ماہنامہ

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۵ رجب المرجب ۱۴۴۳ھ، فروری ۲۰۲۲ء

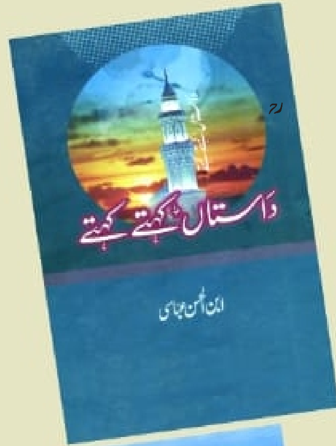
النخیل

کراچی

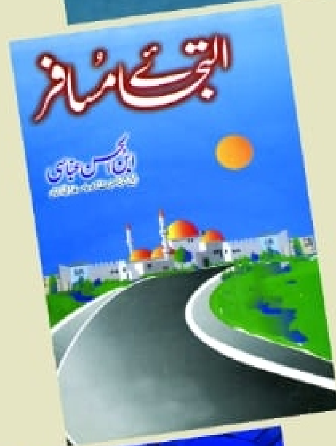
بانی

ابن الحسن عباسی رحمۃ اللہ علیہ

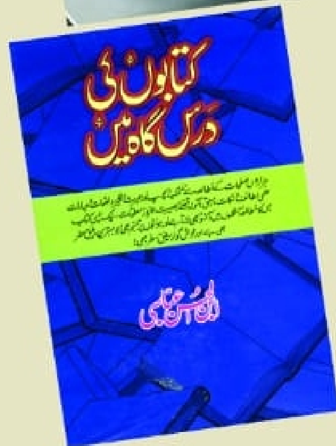
ادارہ تراث الادب کی مطبوعات













رابطہ نمبر:03444023470-03004097744

اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

النخیل

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۵، رجب المرجب ۱۴۴۳ھ، فروری ۲۰۲۲ء

ادارہ تراث الادب

alnakhil786@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فی شمارہ:.... 60روپے **سالانہ زرِتعاون** :.... 600 روپے

خط و کتابت کا پتہ:.....ادارہ تراث الادب، ۰۷/ دس آر، آریہ نگر، خانیوال

رابطہ نمبر:.......... 03004097744-03444023470

ای میل ایڈریس: alnakhil786@gmail.com

صدائے نخیل

خبر لیجے دہن بگڑا......!

مدیر کے قلم سے

جدید ٹیکنالوجی اور دنیا میں بڑھتی ہوئی مادی ترقی نے جہاں زندگی بہت آسان اور بڑی تیز کر دی ہے، وہاں اس سے بڑی خرابیاں بھی پیدا ہوئی ہیں، سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارم جدید ٹیکنالوجی کی پیدا کردہ اہم سہولت ہیں، جنہوں نے انسان کی ذاتی، گھریلو اور اجتماعی زندگی کے اطوار بدل ڈالے ہیں، ان سماجی پلیٹ فارم کے ذریعے جہاں لوگوں کے باہمی رابطوں کی مشکلات ختم اور فاصلے سمٹ گئے ہیں، اپنی بات کا ابلاغ آسان ہوگیا ہے، علم اور معلومات کا بھی ایک سیلاب سا آگیا ہے اور ہر طرح کی معلومات ہر شخص کی دسترس میں آگئی ہیں، وہاں سماجی رابطوں کے ان ذرائع کا منفی استعمال بھی ہمارے ملی وقومی وجود کے لیے ایک سنجیدہ خطرے کا روپ اختیار کرتا جا رہا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ مختلف گروہوں اور افراد نے ان ذرائع کو اپنے حق میں اور دوسروں کے خلاف پروپیگنڈے کا اہم وسیلہ بھی بنا رکھا ہے، جس کی وجہ سے سوشل میڈیا کے تمام پلیٹ فارم پر بیشتر ہمہ وقت نفرت انگیزی اور دشنام طرازی کا محاذ گرم رہتا ہے۔ جس کا جب جی چاہتا ہے کسی کے بھی خلاف کچھ بھی نشر کر دیتا ہے اور اس فعل میں ہر شخص آزاد ہے، کسی پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے، جس کے نتیجے میں جدید ٹیکنالوجی کے یہ اہم ذرائع مثبت کاموں کی بجائے معاشرے کو منفی رخ پر ڈالنے کا وسیلہ زیادہ بن رہے ہیں۔ یہ صورتحال دین اسلام کی اخلاقی اور سماجی تعلیمات کے تحت بھی شنیع اور قابلِ مذمت ہے اور دنیا کے مسلمہ اخلاقی اصولوں اور قوانین میں بھی یہ قابل اصلاح ہے۔

کسی بھی شئے کے مثبت اور منفی ہر دو طرح کا استعمال کیا جا سکتا ہے، مثبت استعمال سے لوگوں کو فائدہ جبکہ غلط اور منفی استعمال کا نتیجہ براہی برآمد ہوتا ہے اور یہ سرعام ہو تو اس کے منفی اثرات سے پورا سماج متاثر ہوسکتا ہے۔ بدقسمتی سے موثر روک ٹوک نہ ہونے اور ادارتی نگرانی سے آزادی کے باعث

پاکستان میں سوشل میڈیا ایک اَن گائیڈڈ میزائل کی صورت اختیار کر چکا ہے، جو کسی بھی وقت کسی کو بھی نشانہ بنا سکتا ہے اور یہ مواصلات اور معلومات کے اس اہم ذریعے کے منفی استعمال کا ہی نتیجہ ہے۔ سوشل میڈیا کے مختلف فارم کا منفی اور غلط استعمال اس قدر پروان چڑھ چکا ہے کہ اب کسی کی بھی عزت محفوظ نہیں رہی۔ بالخصوص سیاسی کارکنان اور مختلف طبقات نے سوشل میڈیا کو جس طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے وسیلے کے طور پر اپنا لیا ہے، اس نے بڑی بھیانک شکل اختیار کر رکھی ہے اور بڑے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں چھ کروڑ سے زیادہ افراد سوشل میڈیا کا استعمال کرتے ہیں اور اس تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک رپورٹ بتاتی ہے کہ بعض محققین نے تیس لاکھ افراد کی تین لاکھ ٹوئٹس کا جائزہ لیا تو اس میں نوے فیصد سے زیادہ منفی پروپیگنڈے، جعلی خبروں اور نفرت انگیزی پر مشتمل تھیں۔ یہ صرف ایک سوشل پلیٹ فارم ٹوئٹر کا حال ہے، اس سے فیس بک سمیت دیگر بہت سے معروف سماجی ذرائع پر لمحہ بہ لمحہ کی جانے والی پوسٹنگ اور شیئرنگ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملک میں جس طرح سوشل میڈیا صارفین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، اگر معاشرے کے بااثر افراد اور سوشل لیڈرز نے مثبت استعمال کے لیے اپنے زیرِ اثر لوگوں کی تربیت نہیں کی اور یونہی آزاد چھوڑ دیا گیا تو آنے والے دنوں میں شریف لوگ سوشل میڈیا کا استعمال ہی چھوڑ دیں گے اور پھر ہر طرف نفرت، عداوت اور بے ہودگی کا زہر پھیل جائے گا۔

یوں تو سوشل میڈیا پر جعلی خبروں، نفرت انگیزی، الزام تراشی، بدگوئی، سنسنی خیزی اور واقعات کو اصل پس منظر سے ہٹا کر غلط رخ سے پیش کرنے کی روش کے باعث ہمیشہ ہی بے ہودگی کا طوفان برپا رہتا ہے، تاہم حالیہ دنوں میں جس طرح مختلف سیاسی و مذہبی جماعتوں کے رہنما اور کارکنان ایک دوسرے پر ذاتی حملوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، وہ انتہائی شرمناک ہے۔ یہ نہ صرف معاشرے کی انتہائی بگڑی شکل کا عکاس ہے، بلکہ اس کی اصلاح نہ کی گئی تو یہ صورتحال عام سماجی مشق ہو کر رہ جائے گی جو اخلاقی تباہی کی آخری منزل ہے۔

حکومت پاکستان کی جانب سے اداروں اور شخصیات کے تحفظ کے لیے برقی ذرائع پر ہونے والے اخلاقی جرائم کے خلاف قوانین کو مزید سخت کرنا اچھا اقدام ہے، مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ

حکمران پہلے خود غیر اخلاقی زبان اور لب ولہجہ اختیار کرنے سے گریز کریں۔قیادت وسیادت کے منصب پر فائز شخصیات پر یہ اضافی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ گفتار اور کردار میں عوام بالخصوص نوجوان نسل کے لیے ایک عمدہ نمونہ پیش کریں اور اپنے سیاسی مخالفین کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے تہذیب، شائستگی اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیں۔عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ **کلام الملوک ملوک الکلام** یعنی بادشاہوں اور حکمرانوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوا کرتا ہے۔ جہاں حکمرانوں اور قائدین کی دیگر عادات واطوار کو عوام اور کارکنان اپناتے ہیں، وہیں ان کی گفتار کا اثر بھی نچلی سطح پر نفوذ اختیار کر جاتا ہے۔ ہماری سیاست کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں انتہائی بالائی سطح پر بسا اوقات نہایت نیچ قسم کی گفتار کے مظاہر سامنے آجاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ پھر نچلی سطح پر کارکنوں کے درمیان سوشل میڈیا پر گالم گلوچ، بہتان طرازی، بدتہذیبی، یاوہ گوئی اور سر پھٹول کی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں ملک کا انتظامی سربراہ عوامی جلسوں میں ٹی وی کیمروں کے سامنے مخالفین پر دشنام طرازی اور استہزاء وتمسخر کو روا سمجھتا ہو، وہاں پھر سوشل میڈیا کے من چلوں کو غیر اخلاقی زبان کے استعمال سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔

اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ سوشل میڈیا پر بدتہذیبی کے طوفان کو روکنے کے لیے محض قانون سازی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے سماجی شعور کی بیداری ناگزیر ہے اور سماج کا شعور تب بیدار ہوتا ہے جب سماج کے رہنما اور تعلیم وتربیت سے متعلق ادارے اپنے فرائض کا ادراک کریں اور سب سے پہلے خود کو ایک آئیڈیل بنا کر قوم کے سامنے پیش کریں۔اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمارے حکمرانوں اور سیاسی ومذہبی رہنماؤں کو اپنے فرض کا ادراک ہونا چاہیے اور ہر سطح پر غیر اخلاقی رویوں کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔

ذرائع ابلاغ کے پلیٹ فارموں کو بھی اپنے پروگراموں میں بہتان طرازی اور بدتہذیبی کی قطعا ممانعت کرنی چاہیے اور علماء کرام اور اساتذہ کو بھی نوجوان نسل کو آدابِ اختلاف کی تعلیم دینی چاہیے اور غیر اخلاقی زبان سے اجتناب کی تلقین کرنی چاہیے۔۔اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو۔

محمد شفیع چترالی

۱۸ رجب المرجب ۱۴۴۳ھ

اردو زبان

قومی زبان کا نفاذ

مولانا ابن الحسن عباسی

اردو زبان، ایک میٹھی اور شیرین زبان ہے، اس میں ایک عجیب لطافت اور شائستگی ہے، کہتے ہیں کہ دنیا کے مختلف خطوں کے لوگ شمالی ہندوستان میں جمع ہوئے اور ان کی اکھٹ سے یہ زبان وجود میں آئی، اس میں عرب بھی تھے اور اہل ترک وشیراز بھی ...... اس لیے اردو میں مقامی نزاکتوں کے ساتھ بلبل شیراز کی لے بھی ہے، ترک و بلقان کے لہجوں کا مدو جزر بھی ہے اور عربوں کی حدی خوانی کا ترنم بھی...... یہ مختلف قوموں کے بزم و رزم کے حسین لہجوں کا خیابان بہار ہے! اس زبان کو وجود میں آئے ہوئے ہزار سال ہونے کو ہے۔

اردو زبان پاکستان کی قومی زبان اور ہندوستان کی چھ ریاستوں کی سرکاری زبان ہے، دنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے، ۲۵ فروری ۱۹۴۸ کو اسے پاکستان کی قومی زبان قرار دیا گیا تھا۔

قائد اعظم محمد علی جناح نے کہا تھا: "میں واضح الفاظ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی" اور اس سے پہلے ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں نہرو صاحب نے کہا تھا: "مجھے اردو زبان سے محبت ہے، میں اس کو اپنی زبان سمجھتا ہوں اور اپنے ہندوستان کی زبان، مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ اردو میری قومی اور مادری زبان ہے۔"

۷۳ کے آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ میں کہا گیا کہ اردو کو اگلے پندرہ سال میں پاکستان کی مکمل سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے گی، ۱۹۸۸ کو یہ پندرہ سال پورے ہوئے لیکن اردو سرکاری زبان نہ بن سکی۔

۲۰۰۳ء میں کوکب اقبال ایڈووکیٹ صاحب نے سپریم کورٹ میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دلانے کے لئے پٹیشن دائر کی اور ۱۲ سال بعد ۸ ستمبر ۲۰۱۵ء کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب جواد ایس خواجہ نے اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کا فیصلہ سنایا کہ تین ماہ کے اندر وفاقی اور صوبائی قوانین کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ سرکاری محکمے، عدالتی مقدمات کے اردو میں جوابات لکھیں، سی، ایس، ایس، این، ٹی، ایس اور مقابلے کے دیگر امتحانات اردو میں ہوں۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو بھی دو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا لیکن سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کا نفاذ نہیں ہو سکا۔

مشہور جرمن اسکالر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ اردو زبان میں بڑی مہارت رکھتی ہیں، وہ ہندوستان کا دورہ کر کے پاکستان آئیں، اردو کے نامور و بے مثال ادیب مشفق خواجہ مرحوم سے ملنے آئیں، ہندوستان کے حالات کی روشنی میں انہوں نے کہا کہ اردو زبان کا مستقبل مجھے مخدوش نظر آتا ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا:

> "ایسا نہیں، اردو کا مستقبل دینی مدارس کی وجہ سے روشن ہے، برصغیر کے ہزاروں دینی مدارس کی تعلیمی زبان اردو ہے، ان کے دروس اور ان کی نصابی کتابوں کے شروح اردو میں ہیں، جب تک یہ مدارس ہیں، اردو کو زوال نہیں آسکتا۔"

اردو زبان میں اسلامی موضوعات پر اس قدر لکھا گیا ہے کہ اس حوالے سے کوئی اور زبان اس کی ہمسری نہیں کر سکتی......اور آخر میں اردو زبان کے دو شعر:

خدا نے کیوں دل درد آشنا دیا ہے مجھے
اس آگاہی نے تو پاگل بنا دیا ہے مجھے
میں وہ چراغ ہوں جو اندھیروں میں روشن تھا
خود اپنے گھر کی ہوا نے بجھا دیا ہے مجھے

(انتخاب از قلم نما)

☆......☆......☆

تعلیم وتربیت

غم کے لمحات میں صبر کا تقاضا

مولانا بدرالحسن القاسمی

زندگی میں خوشی کے لمحات بھی آتے ہیں اور غم والم کی ساعتیں بھی، خوشی کے وقت شکر اور آزمائش کے وقت صبر مطلوب ہے لیکن آدمی جلد بے قابو اور جلد مایوس ہوجانے والی مخلوق ہے:

اذا مسه الشر جزوعا واذا مسه الخير منوعا

ہر بات مرضی کے مطابق ہو یہ اس دنیا میں ممکن نہیں ہے، اس کی زندگی تو اسی میں ہے کہ کبھی کامیاب وکامراں ہو اور کبھی ناکام ونامراد، اس کے سامنے جو ہو رہا ہے، اس میں سے کچھ اسے پسند ہو اور کچھ ناپسند، اسے غصہ بھی آئے اور خوشی بھی ہو، اکبر کے بقول:

بے حد آتا ہے مجھے غصہ مگر کس پر کروں؟

انسان کی اسی بے بسی میں، اس کی تمام تر کامیابیوں کا راز ہے، وہ خدا کو مانتا ہے جس کا حکم سب پر چلتا ہے۔ وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے، وہ نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے، وہ ناکامیوں پر مایوس ہونے کے بجائے نئے حوصلہ کے ساتھ پھر کھڑا ہوجاتا ہے۔

اس کی ہر خواہش تو دوسری دنیا میں ہی پوری ہوسکتی ہے، جنت ہی وہ جگہ ہے جہاں (ما تشهيه الانفس) جس چیز کا جی چاہے، وہ فراہم ہوگی۔ جہاں کوئی آویزش نہ ہو:

بہشت آن جاست کہ ازارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

غم کے اسباب پیدا ہوتے ہیں تو آدمی غم کا شکار ہو جاتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ھم وغم اور حزن سے پناہ مانگنے کی دعا سکھلائی ہے۔

کسی حادثہ پر کتنا غم کیا جائے؟ صبر کا تقاضا بھی پورا ہو اور انسانی کمزوری کے تحت فطری غم جو لاحق ہوتا ہے، اسے بھی نہ دبایا جائے:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں ؟

کہا جاتا ہے کہ اپنے وقت کے نامور بزرگ غالبا فضیل بن عیاض کو خبر دی گئی کہ ان کے بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے تو وہ زور سے ہنسے جس سے لوگوں کو حیرت ہوئی، دراصل وہ قضاء پر رضا کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے اس رویہ پر تنقید کی ہے کہ سنت کے مطابق اور انسانی فطرت سے ہم آہنگ یہ ہے کہ جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے انتقال پر غم کا اظہار فرمایا تھا کہ آپ کی مبارک آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا:

ان القلب لیحزن و ان العین لتدمع و لا نقول الا ما یرضی ربنا و انا لفراقک یا ابراھیم لمحزونون

انسانی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ غم کے آنسو نکلیں، حادثہ پر افسوس ہو اور ساتھ ہی اللہ کے فیصلہ اور اس کی تقدیر پر اعتراض بھی نہ ہو، آدمی پر غم کا فطری اثر بھی ہو اور وہ رضا شیوہ بھی رہے، رب کائنات سے عافیت بھی مانگے اور غم سے اللہ کی پناہ بھی مانگے:

وقل رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین

چند سال پہلے میرے جواں سال بیٹے کا، تعلیم کی تکمیل کے بعد وفات کا سانحہ پیش آیا جو سنگین تھا، پھر کچھ عرصہ بعد اس کی ماں بھی ساتھ چھوڑ گئیں، اس عمر میں شریک حیات کا جدا ہو جانا انسان کے لیے کتنا صبر آزما مرحلہ ہے، اس کا اندازہ مشکل نہیں ہے لیکن خدا کے فیصلہ اور اس کی تقدیر کے بارے میں مؤمن کا یقین یہی ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق ہے (یفعل ما یشاء) جو چاہتا ہے کرتا

ہے اوراس کی ذات حکیم ہے:

فعل الحکیم لا یخلو من الحکمة (حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، ہماری مصلحت کو بھی وہی بہتر جانتا ہے۔)

ایسے سنگین حادثہ کا اثر آدمی کے ذہن ودماغ پر بسا اوقات بے حد خطرناک ہوتا ہے، اچھے اچھے اورنامور عالم اورامام وقت بھی اپنا ہوش وحواس گم کر بیٹھتے ہیں، اس کی واضح مثال **تاج العروس** کے مؤلف علامہ مرتضی الزبیدی البلگرامی کی ہے، جنہوں نے **احیاء علوم الدین** کی بھی ضخیم شرح لکھی ہے، وہ بلند پایہ محدث، امام لغت اور بڑے باکمال لوگوں میں تھے۔

ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا تو سارے علمی کاموں سے کنارہ کش ہوگئے، دنیا بھر میں اپنی مقبولیت کو فراموش کردیا اوراپنی حد سے زیادہ محبوب بیوی کی قبر پر ایک خوشنما قبہ بنا کر اس میں بیٹھ گئے۔

درس وتدریس، تصنیف وتالیف سبھی کا سلسلہ موقوف ہوگیا اورنہایت ہی مؤثر اور درد انگیز مرثیے کہنے لگے اورلوگوں کی ملامت اوراہل علم کی بدگمانی کسی چیز کا ان کوخیال نہیں رہا، جبرتی نے عجیب و غریب ان کے حالات لکھے ہیں، علی طنطاوی صاحب نے بھی اسی کو نقل کیا ہے۔

بلاشبہ وہ بڑے عالم اورامام وقت تھے، انھوں نے چالیس جلدوں میں عربی کی سب سے بڑی لغت **تاج العروس** لکھی، دس جلدوں میں **اتحاف السادہ المتقین** لکھی، اوربھی کتابیں تصنیف کیں لیکن ان کے دل پر مصری اہلیہ کی محبت اس درجہ غالب ہوئی کہ اپنے مرنے کے ساتھ سید مرتضی زبیدی کے ہوش وحواس سب ساتھ لے گئی۔ انہوں نے توغم سے مغلوب ہوکر ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو اتنے بڑے عالم سے عجیب لگتی ہیں لیکن غم ہی ناقابلِ برداشت ہوتو گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں ہوتا:

سابکي علیها ما حییت فان امت

ستبکی نظامی والاضالع فی القبر

ولست بها مستبقیا فیض عبرة

وطالبا بالصبر عاقبة الصبر

غم اگر ہمہ وقتی "ھم" بن جائے تو انسان اپنے ہوش حواس کھو دیتا ہے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے غم اور حزن سے پناہ مانگنے کی دعا سکھلائی ہے اور ہمیں تو شریعت کے حکم کے مطابق صبر کی کوشش بھی کرنی ہے اور صبر پر اجر کی بھی امید ہے اور اصل یہ ہے کہ جسے اللہ نے اپنے پاس بلالیا ہے، اسے راحت نصیب ہو اور اس کی قبر کو جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری بنادے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز



گلہائے رنگا رنگ

آہستہ ہونا۔۔۔شائستہ ہونا ہے!

ڈاکٹر تحسین فراقی

با ادب سے بے ادب ہونے میں پہلا فرق، آواز کا بلند ہونا ہے۔ بے ادب وہ نہیں ہوتا، جو ادب کرنا جانتا نہ ہو، بلکہ بے ادب وہ ہوتا ہے جو ادب کرنا ترک کر دے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ گفتار میں آواز کا مدھم رکھنا آدابِ محفل میں بھی ہے اور آدابِ زیست میں بھی! بلند آواز......سماعت ہی پر نہیں، دل پر بھی گراں گذرتی ہے......اور یہیں سے ادب سے محروم ہونے والا، نصیب سے بھی محروم ہونے لگتا ہے۔

بانصیب ہونا، دراصل خوش نصیب ہونا ہے۔ بدنصیب تو وہ ہوتا ہے جس کے نصیب پھوٹ جائیں۔خوش نصیبی کسی خوش نصیب کی معیت حاصل ہونے کا نام ہے۔ جو معیت میں ہوتا ہے، اسے بھلا اپنی آواز بلند کرنے کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے!! بڑی بھاری دلیل بھی آواز کے بلند ہونے پر اپنا وزن کھو دیتی ہے۔ اگر آپ جانتے ہیں......تو یہ بتانا ضروری نہیں کہ آپ جانتے ہیں۔ جواب ہمیشہ سوال کی دریافت ہوتا ہے۔ مسافر تیز رفتار بھی ہو، تو گفتار میں مدھم آواز ہوتا ہے......کیونکہ اسے راستہ لینا ہے۔ سفر اِذن سے شروع ہوتا ہے......حکم سے طے ہوتا ہے......اور اَمر پر تمام ہوتا ہے۔ حکم لینے کے لیے زبان سے زیادہ کان کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے......تاکہ آنکھیں بھی کھل سکیں!!

انسان کے علاوہ شاید ہی کوئی اور مخلوق ہو، جو سرگوشی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو......جی ہاں! جانور اپنی آواز کو دھیما کرنے کا اختیار نہیں رکھتے......اس لئے وہ جتنے بھی بلند قامت ہوں، پست شمار ہوتے ہیں!! انسان اس لئے بھی انسان ہے کہ وہ خود پر اختیار رکھتا ہے۔ محبت کے علاوہ انسان اگر کہیں اور

بے اختیار ہو جائے تو شرفِ انسانیت سے معزول کر دیا جاتا ہے۔ جسے محبت بے اختیار نہیں کرتی‘ اسے جبلت بے اختیار کر دیتی ہے اور جبلتوں کے جنگل میں رہنے والے جانور ہوتے ہیں، ان کی چھاگل میں پانی نہیں ہوتا...... دوسروں کے لیے!! گدھوں کا ہینکنا، گھوڑوں کا ہنہنانا، سانپوں کا پھنکارنا، بندروں کا خوخیانا، ہاتھیوں کا چنگھاڑنا، اور شیروں کا دھاڑنا...... بالعموم ایک ہی والیوم پر ہوتے ہیں۔ یہ حضرتِ انسان ہے جو اپنی آواز کا قد قدرے کم کر سکتا ہے...... اِس کی قدر اِسی میں ہے!!

آہستہ ہونا...... شائستہ ہونا ہے۔ گفتار اور رفتار میں آہستہ روی ایک باوقار شخصیت کی نشانی ہوا کرتی ہے۔ کردار اور اعتماد سے محروم‘ میانہ روی سے بھی محروم ہوتا ہے۔ تیز بولنا‘ اتنا نقصان دہ نہیں‘ جتنا اونچا بولنا۔ تیز بولنے والا خلق میں ابلاغ کے حوالے سے کمزور ہوتا ہے...... لیکن اونچا بولنے والا خود کو ناپسندیدہ خلائق بھی بنالیتا ہے۔ دھیما مزاج رکھنے والا حادثے کا شکار نہیں ہوتا۔ حادثہ صرف وہی نہیں‘ جو سڑک پر ہوتا ہے...... حادثہ تعلقات کی دنیا میں بھی رونما ہوتا ہے...... اور اسے سانحہ کہتے ہیں! اونچا بولنا........... تعلقات میں اونچ نیچ کا سبب بنتا ہے۔

اونچا بولنا بالعموم کسی ردِّعمل کا مظاہرہ ہوتا ہے...... اور یاد رہے کہ ردِّعمل ایک ردّی عمل ہوتا ہے۔ کسی عمل میں مصروف انسان کے پاس ردِّعمل میں بولنے کا نہ مزاج ہوتا ہے‘ نہ فرصت! بامعنی عمل وہ ہوتا ہے جو کسی ردّعمل میں نہ ہو!! ردِّعمل میں مبتلا شخص دراصل ابتلا میں ہے...... اس کی مصروفیت کا کوئی مصرف نہیں ہوتا!

غصہ...... ایک بارود ہے...... اور اونچی آواز اسے آگ لگا دیتی ہے۔ گلا پھاڑتی ہوئی آواز کانوں کو بھی پھاڑتی ہے۔ غصہ ایک زہر ہے...... اور اس کا تریاق خاموشی ہے!! دنیا میں کون ہے‘ جسے غصہ نہیں آتا...... مگر پکڑ میں وہی آتا ہے جو اونچی آواز میں اس کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ تہذیب کی عمارت کو تعمیر کرنے میں صدیوں اور نسلوں کی محنت درکار ہوتی ہے...... غصے کا ڈائنامائیٹ اسے پل بھر میں زمیں بوس کر دیتا ہے۔ غصے کا اظہار بغیر آواز کے بھی ہو جاتا ہے...... یہ ایسا پتھر ہے جو گدلے جذبات کی لہروں پر سفر کرتا ہے، مزاج کے دائروں کو درہم برہم کرتا ہے...... اور کسی کثیف کیفیت کی دلدل

میں دھنس کر غائب ہو جاتا ہے۔ غصہ چہرے سے بھی عیاں ہو جاتا ہے......ہم پڑھ لکھ کر لکھنا پڑھنا بھول گئے......دوسروں کے چہروں پر لکھا ہوا کچھ بھی نہیں پڑھ پاتے......نہ سوالات' نہ لکیریں!! انسانوں کی بستی میں جاہل وہ ہے' جو جذبات کی زبان نہیں جانتا!! جو چہرے پڑھنا جانتا ہے' اسے اپنی آواز کو بلند نہیں کرنا پڑتا۔ عورت کی آواز اور مرد کا ہاتھ بلند نہ ہو' تو گھروں میں سکون کا راج ہو!! گھر میں سکون کا راج ہونے کے لیے کسی کا "راجکماری" ہونا ضروری نہیں۔ دست درازی کا تعلق بالعموم زبان درازی سے ہوتا ہے۔ گھروں میں دھیمی آواز میں بولنے کا چلن عام ہو جائے تو ماحول خوشگوار ہو جائے۔ طبی اعتبار سے بھی سردرد کی ایک بنیادی وجہ اونچی آواز میں بولنا اور سننا ہے!! اونچا سننا......اونچا بولنے سے بہتر ہے۔ بعض آوازیں سمع خراش بھی ہوتی ہیں......اور دِل خراش بھی!! دل کی آواز کبھی دلخراش نہیں ہوتی!!

مدھم آواز......مدھر ہوتی ہے۔ اونچی آواز شور کی ہم آواز ہے۔ شعور مترنم ہوتا ہے......شور بے ہنگم ہوتا ہے۔ اونچے سُر بھی اونچے نہیں ہوتے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ شور کے بجائے شعور کے قریب رہنا پسند کرتی ہے۔ مدھم اور مدھر آوازوں کو چھوڑ کر کرخت اور اونچی آوازوں کا راستہ اختیار کرنا انسان کا ایک سفرِ معکوس ہے۔ سفرِ معکوس غیر فطری راستوں پر ہوتا ہے!!

گفتگو میں آواز مدھم ہوتی ہے......جھگڑے میں آواز بلند ہو جاتی ہے۔ کسی جگہ دو اشخاص اونچی آواز میں بول رہے ہوں' تو سننے والے کو شبہ پڑتا ہے کہ وہ جھگڑ رہے ہیں۔ محبت آواز سے کھرج چھین لیتی ہے۔ محبت کرنے والوں کی آوازیں لوچ اور دھیمے پن سے پہچانی جاتی ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ محبت کے بغیر انسان کو یہی نہیں معلوم ہو پاتا کہ وہ کس سے سننا چاہتا ہے اور کسے سنانا چاہتا ہے......چنانچہ وہ فرد کے بجائے مجمع کو سنانا شروع کر دیتا ہے......نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسے لاؤڈ سپیکر میں بولنا پڑتا ہے۔ دُور کی آواز کو دُور تک پہنچانے کے لیے لاؤڈ سپیکر نہیں' بلکہ اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ دل کی آواز سننے کے لیے' دل کبھی بھی دُور نہیں ہوتے۔ بس! ہم دلوں کے بجائے سماعتوں سے ٹکراتے رہتے ہیں' اس لیے ہاتھ میں لٹھ اور لاؤڈ سپیکر کی ضروت محسوس کرتے ہیں۔ سماعتوں میں

رس گھولنے والے کلمات دھیمے اور مدھر لہجے میں سنائے جاتے ہیں!! لاؤڈ سپیکر کے بغیر بھی لاؤڈ نہیں ہونا چاہیے! طعن و تشنیع اور طنز زیرِلب بھی ہو تو آواز کے اونچا ہونے سے تعبیر ہوگی!! اپنی آواز کو بلند کرنے کے لیے بلند آواز ہونا ضروری نہیں!!

اونچی آواز میں بولنا یقیناً کوئی معاشرتی جرم ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم میں آوازوں کو قاعدہ سکھانے کا با قاعدہ اہتمام کیا گیا ہے۔ آواز اونچی ہو جائے تو قاعدے سے باہر ہو جاتی ہے۔ سورۃ لقمان میں فرمایا گیا کہ سب سے بری آواز گدھے کی ہے، سورۃ مائدہ میں بتایا گیا کہ اللہ اونچی آواز کو پسند نہیں کرتا...... اور جو بات اللہ اپنے لیے پسند نہیں کرتا، اپنے حبیب ﷺ کے لیے بھی پسند نہیں فرماتا۔ سورۃ الحجرات میں اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کے سامنے بلند آواز میں بات کرنے کی تعظیماً ہی نہیں حکماً بھی ممانعت کر دی...... یہاں تک تنبیہ کر دی کہ اُن (ﷺ) کے حضور بلند آواز نہ ہو جاؤ ...... اللہ کے نبی ﷺ کو ایسے نہ پکارو، جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو نام لے کر پکارتے ہو...... کہیں ایسا نہ ہو، کہ تمہارے سب اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور تک نہ ہو...... گویا شعور کا سلب ہونا جس جرم کی سزا ہے، وہ اللہ کے حبیب ﷺ کے حضور اپنی آواز کو بلند کرنا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے لائے ہوئے دین میں آئے دن اپنی من پسند تشریح و توضیح شامل کرنا...... الہامی کلام میں ذہنی تصرف کرنا بھی اللہ کے رسول ﷺ کے ادب کے باب میں تقدم تصور ہوگا...... بعد میں آنے والوں کے لیے اونچی آواز میں بولنے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ اسی سورۃ میں اللہ کریم نے دلوں کا تقویٰ اپنے حبیب ﷺ کے حضور ادب سے منسلک کر دیا۔ یہاں تقویٰ کا ایک مفہوم تکریمِ نبی ﷺ ہے!! قلوب کا امتحان جس بارگاہِ ادب میں ہوتا ہے، وہ بارگاہِ نبوی ﷺ ہے!!

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفَس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

(آسمان کے نیچے یہ ایسی ادب گاہ ہے جو عرش سے بھی زیادہ حساس ہے، یہاں تو جنید اور بایزید بھی (ادب میں) اپنا سانس گم کر لیتے ہیں)

حضرت جنید بغدادیؒ راہِ سلوک کے سرخیل ہیں اور حضرت بایزید بسطامیؒ وادی جذب کے شہسوار ہیں۔ بارگاہِ نبوی ﷺ میں جذب اور سلوک دونوں ادب سے سرنگوں ہیں۔ گویا یہاں جذب بھی سانس روکے ہوئے ہے اور سلوک بھی اپنے پاس و انفاس سمیٹ کر خاموش، باادب کھڑا ہے۔

صاحبِ حال مرشدی واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں:

آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہر بلندی سے بلند
پست ہر آواز کا قد آپ ﷺ کی آواز سے

دست بستہ دُعا ہے کہ اللہ کریم ہمیں اپنے محبوب ﷺ کے حضور باادب حاضری کی توفیق عطا فرمائے......اور آپ ﷺ کے اُمّتیوں کے سامنے بھی ہمیں مدھم ہونے اور دھیمی آواز میں محوِ کلام ہونے کا شرف عطا فرمائے! رسولِ کریم ﷺ سے محبت کا تقاضا اور ثبوت اُن (ﷺ) کے اُمتیوں کے ساتھ انکسار، اخلاق اور تواضع کا سلوک بھی ہے۔

☆......☆......☆

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

آیا تھا کیوں عدم میں کیا کر چلا جہاں میں
یہ مرگ و زیست تجھ بن آپس میں ہنستیاں ہیں

کیونکر نہ ہو مشبک شیشہ سا دل ہمارا
اس شوخ کی نگاہیں پتھر میں دھنستیاں ہیں

برسات کا تو موسم کب کا نکل گیا پر
مژگاں کی یہ گھٹائیں اب تک برستیاں ہیں

لیتے ہیں چھین کر دل عاشق کا پل میں دیکھو
خوباں کی عاشقوں پر کیا پیش دستیاں ہیں

اس واسطے کہ ہیں یہ وحشی نکل نہ جاویں
آنکھوں کو میری مژگاں ڈوروں سے کستیاں ہیں

قیمت میں ان کے گو ہم دو جگ کو دے چکے اب
اس یار کی نگاہیں تس پر بھی سستیاں ہیں

ان نے کہا یہ مجھ سے اب چھوڑ دخت رز کو
پیری میں اے دوانے یہ کون مستیاں ہیں

جب میں کہا یہ اس سے سوداؔ سے اپنے مل کے
اس سال تو ہے ساقی اور مے پرستیاں ہیں

محمد رفیع سودا (۱۷۱۳-۱۷۸۱)

میرا مطالعہ

میری علمی ومطالعاتی زندگی

ڈاکٹر امجد علی شاکر

پروفیسر ڈاکٹر امجد علی شاکر ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ اسلامیہ کالج، لاہور کا یہ مضمون جو النخیل کی خصوصی اشاعت "مطالعہ نمبر" کے لیے تحریر کیا گیا، تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شاملِ اشاعت نہ ہو سکا، افادہِ عام کے لیے نذرِ قارئین ہے۔ مضمون طویل ہونے کی وجہ سے دو حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے، یاد رہے کہ مضمون نگار کی فکر ونظر سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادارہ]

مطالعہ کا ذوق تو مجھے بچپن سے تھا، گھر میں بہت کتابیں تھیں، زیادہ تر عربی فارسی کتب تھیں، بہرحال اردو کتابیں بھی تھیں، کبھی کبھی یہ کتابیں اٹھاتا اور پڑھ لیتا۔ میٹرک میں نسیم حجازی کا ایک ناول محمد بن قاسم پڑھا۔ پھر اتفاق نہ ہوا کہ انہیں پھر سے پڑھتا۔ ہمارا انٹرمیڈیٹ کا دور بہت ہنگامہ خیز دور تھا یعنی ۷۱-۱۹۶۹ء، یہ بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔ اس دوران میں پاکستان کے پہلے قومی انتخابات ہوئے، ۱۹۷۰ کا پورا سال انتخابی مہم چلتی رہی، اس مہم کی دو خاص باتیں بہت اہم ہیں، ایک تو یہ کہ یہ مہم تقریبا پورا سال چلتی رہی، دوسرے الیکشن میں نظریاتی بحثیں بہت زوروں پر تھیں، ان دنوں سیاسی رسائل بہت چھپتے تھے۔ پمفلٹ اور کتابچے بھی بہت چھپے اور تقسیم ہوئے۔ ایک طرف یہ نعرہ تھا کہ اسلام خطرے میں ہے، دوسری طرف روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ تھا۔ ان دنوں میں اگرچہ سائنس کا طالب

علم تھا مگر سیاسی فضا سے لاتعلق رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں سیاسیات میں زیادہ ہی دلچسپی رکھتا تھا، اخبار پڑھتا، رسائل پڑھتا اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان دنوں پڑھنے کا چسکا پڑا اور اس کا واحد مؤثر سیاسی فضا اور سیاست سے دلچسپی تھا۔

۷۳-۱۹۷۱ء میرا بی ای کا سیشن تھا، اس سیشن کا خاص واقعہ سقوطِ ڈھاکہ ہے، اب میں اس واقعے کو یہ نام نہیں دیتا، یومِ آزادی بنگلہ دیش کہتا ہوں۔ اس واقعے کے دو ماہ بعد نیشنل عوامی پارٹی کے مرکزی جنرل سیکرٹری امین مغل اوکاڑا آئے، میں ان دنوں اوکاڑا کے سرکاری کالج کا طالب علم تھا۔ مجھے ایک دوست پروفیسر امین مغل کی تقریب میں لے گئے۔ یہ تقریب مقامی ہوٹل کے ایک کمرے میں ہوئی، سامعین صرف بیس پچیس تھے۔ انہوں نے تقریر کرنے کی بجائے ملکی صورتحال پر عمدہ لیکچر دیا۔ اس لیکچر کی خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے کالونیل اداروں اور نیشنل اداروں کا فرق واضح کیا۔ انہوں نے ہمارے ایک محبوب ادارے کو کالونیل ادارہ قرار دیا، مجھے سن کر بہت غصہ آیا، میں نے یہ باتیں خاموشی سے سن لیں اور ایک مدت تک ان پر غور و فکر کرتا رہا۔ آخر ایک مدت کے بعد مجھے ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرنا پڑا۔ یہ اتنا بڑا سچ تھا جو میرے کالج کے اساتذہ نے کبھی مجھ سے بیان نہ کیا تھا۔ ممکن ہے وہ اس سچائی سے خود بھی ناآشنا ہوں۔

کالج کی تعلیم کے دوران میں میرے دو اساتذہ نے مجھے متاثر کیا، پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی میرے اردو کے استاد تھے، میں نے ان کے قدموں میں بیٹھ کر یہ سیکھا کہ فقرہ کیسے لکھتے ہیں۔ ایک عام نثر سے تخلیقی نثر کس حوالے سے مختلف اور بلند و بالا ہوتی ہے، ہم لوگ اعجاز ضیا قریشی سے انگریزی پڑھتے تھے، انہوں نے اپنے لیکچرز میں یہ سکھایا کہ ادب میں کیا ہوتا ہے اور ادیب کس طرح انسانی نفسیات اور سماج کی تہوں کو کھولتا اور بیان کرتا ہے۔

میں بی اے کے زمانے میں مطالعہ کی طرف صحیح طور پر راغب ہوا، میرے موضوعاتِ مطالعہ تین طرح کے تھے: ادب، مذہب اور سیاست۔ میں نے انٹر کے زمانے میں دو چار سستے قسم کے ناول پڑھے تھے۔ ہمارے دوست تھے، میرے ہی ہم نام تھے، وہ آنہ لائبریری سے کتابیں لاتے اور

پڑھتے۔ وہ ان کتابوں کو پڑھنے کے اس حد تک رسیا تھے کہ ایک آدھ مختصر ضخامت کا ناول وہ آنہ لائبریری میں بیٹھے بیٹھے ہی پڑھ جاتے، میں نے ان کے پاس اس قسم کے ناول دیکھے تو کبھی کبھی پڑھ لیا۔ بی اے کے زمانے میں پتہ چلا کہ وہ سستے قسم کے ناول ادب کیوں نہیں ہیں؟ ادب ایک سنجیدہ سرگرمی ہے، مزاح کی کتاب کی تہہ میں بھی سنجیدہ قسم کی دانش اور فکر موجود ہوتی ہے۔ میں نے بی اے میں شاعری، خاکہ اور مزاح کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ شاعری میں مَیں "غالب" اور "اقبال" کلاس میں پڑھتا تھا اور فیض اپنے کمرے میں بیٹھ کر، میں نے رشید احمد صدیقی کی کتابیں "گنج ہائے گراں مایہ"، "ہم نفسانِ رفتہ" اور "مضامینِ رشید" دل لگا کر پڑھیں، میں سیاسیات کے مضمون کو پورے خلوص اور دلجمعی سے پڑھتا رہا۔ مگر نصاب کی کتاب سے آگے پڑھنا نصیب نہ ہوا، میں نے ایک آدھ کتاب مارکسزم پر پڑھی ہوگی، شاید کتاب نہیں کتابچہ پڑھا ہوگا۔

میں نے بی اے کے دوران میں ایک ناول پڑھا تھا، وہ تھا میکسم گورکی کے ناول "ماں" کا اردو ترجمہ، اس میں مجھے ماں کا کردار بہت اہم لگا۔ میں نے ان دنوں ایک ہفت روزہ رسالہ "کہانی" کا باقاعدہ مطالعہ کیا، اس میں افسانے چھپتے تھے، اس کا ایک خاص نمبر مجھے اب بھی یاد ہے، اس میں ایک بنگالی ناولٹ کا اردو ترجمہ چھپا تھا، یہ بہت اہم لگا، میں اب بھی محسوس کرتا ہوں: یہ ناولٹ بہت اہم ہے۔ میں نے ہفت روزہ نصرت اور روزنامہ امروز کے ادبی صفحے کا مطالعہ کیا، نصرت اور امروز میں اقبال شیدائی کی آپ بیتی "ایک انقلابی کی ڈائری" شائع ہوتی تھی، میرے خیال میں یہ بہت اہم کتاب ہے، تحریکِ ہجرت کے مآخذ میں سے ایک ہے۔ عزیز ہندی کے ساتھ ساتھ اقبال شیدائی کا کردار بھی بہت اہم ہے، یہ آپ بیتی کتابی صورت میں نہ چھپ سکی۔ میں نے اس زمانے میں شورش کاشمیری کی کتابیں "ظفر علی خاں" اور "حمید نظامی" پڑھیں۔ میرے خیال میں شورش نثر میں ایک جاندار اسلوب کے حامل تھے، مگر ان کی زیادہ تر تحریریں وقتی سیاست سے متعلق ہوتی تھیں اور وہ اپنے مخالفین کے لیے زہرناک اسلوب میں لکھتے تھے، اس لیے ان کی بیشتر تحریریں رسالے کے ساتھ ہی پرانی ہوگئیں۔

مذہب کا مطالعہ تو میں بچپن سے کر رہا تھا، میری اماں اس سلسلے میں میری راہنما تھیں۔ وہ پنجابی شاعری کی کتابیں مجھ سے پڑھوا کر سنتیں اور اُن کی تشریح کرتیں، اب بھی دینی رسائل تک میری رسائی تھی، میں نے اس دور میں "خدام الدین" اور "ترجمان اسلام" کا مطالعہ کیا مگر جستہ جستہ۔ یہ دور ۱۹۷۳ء میں ختم ہو گیا اور میں بی اے کر کے اپنے قصبے میں واپس چلا گیا۔

میں نے ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۸ء کے دوران میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی بہت سی کتابیں پڑھیں، چند ایک کے نام تو مجھے اب بھی یاد ہیں۔ یہ کتابیں مولانا کی بہت اہم تصانیف خیال کی جاتی ہیں، مثلاً: "خلافت وملوکیت"، "تنقیحات"، "تفہیمات" تین حصے، "اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی"، "تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان" (جلد اول) یہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے پہلے دو حصوں کا جدید ایڈیشن تھا، بہت بعد میں مَیں نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے تینوں حصے پڑھے، پھر بعد میں مَیں نے مولانا کی چند ایک مزید کتابیں پڑھیں جیسے "قرآن کی چند بنیادی اصطلاحیں"، "مسئلہ ملکیتِ زمین"، "اسلام اور جدید معاشی نظریات" وغیرہ۔

مولانا کے مطالعے کے دوران میں نے مذکورہ کتابوں میں یہ مشاہدہ کیا کہ ان کی تحریروں میں تاریخ سیاسی حوالے کے طور پر آتی ہے، مگر مولانا کے ہاں تاریخ کا علم بہت کمزور نظر آتا ہے، وہ تاریخ کے باب میں چند مقدمات قائم کرتے ہیں اور پھر اپنی بات کا تاریخ پر اطلاق کرتے ہیں، اگر تاریخ کا وہ بیان جو مولانا کے ہاں ملتا ہے غلط ثابت ہو جائے تو ان کے مقدمات کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے، مولانا نے خلافت وملوکیت میں خلافت سے ملوکیت کے سفر کی بعض سنگ ہائے میل بیان کیے ہیں جو کسی بھی طرح درست نہیں، اگر یہ تفصیلات غلط ثابت کر دی جائیں تو مولانا کی پوری کتاب ہی مسترد ہو جاتی ہے، اسی طرح مولانا کی کتاب "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" میں تاریخ کا انتہائی کمزور Version ملتا ہے۔ میں جن دنوں مولانا کو پڑھ رہا تھا، انھی دنوں میں نے "مولانا عبیداللہ سندھی حالات وتعلیمات" مصنفہ محمد سرور کو پڑھا، دونوں کتابوں میں تاریخ کا مختلف ہی نہیں متضاد بیان ملتا ہے، یہاں سے میں نے تاریخ کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی، آخر کار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مولانا

مودودی تاریخ کے متخصص نہیں تھے، ان کے ہاں صحافی کا اندازِ نظر ملتا ہے، محقق کا نہیں، وہ تاریخ کے صرف ایک پہلو کو لے کر پوری تاریخ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

میں نے تنقیحات اور تفہیمات کی بہت تعریف سنی تھی، مگر ان کی کتابیں پڑھتے ہوئے کسی گہرائی کا احساس نہیں ہوا، خصوصاً تفہیمات میں ان کے دو مضامین خاصے مزاحیہ محسوس ہوئے مثلاً ہیگل اور مارکس کا فلسفہ، تاریخ اور ڈارون کا نظریہ ارتقاء، مولانا کی تحریروں کو پڑھ کر کسی نئی تحقیق سے آشنا نہ ہو سکا، مولانا کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے مغربی تہذیب کا استرداد فرمایا ہے، اب میں اس بحث میں تو نہیں پڑتا کہ وہ امپریلزم کے زیر سایہ قائم جدید نو آبادیاتی نظام کی پشتیبانی فرما رہے تھے، وہ کس طرح مغربی تہذیب کی نفی کر رہے تھے، مغربی تہذیب ایک تہذیب تھی، ایک خیالی مضمون تو نہیں تھی کہ آپ چند مضامین سے اس کی نفی کر دیں، مغربی تہذیب اداروں، سرمایہ دارای نظام، جمہوریت اور جدید علوم کے مجموعہ کا نام ہے، کارل مارکس اور اس کے ساتھیوں نے سرمایہ داری نظام کی معیشت اور معاشی اداروں کا رد لکھا تھا۔

علم معاشیات سرمایہ داری نظام کا نقطہ نظر پیش کرتا ہے، مارکس نے اس پر تنقید لکھی ہے اور کموڈوٹی کی سادہ سے پیچیدہ ترین شکل پر بحث کرتے ہوئے داس کیپٹال لکھی ہے، مولانا معاشیات کے عالم تو تھے نہیں، ان کا معاشیات اور مارکسزم کا علم براہِ راست نہیں تھا، اسی طرح وہ نظام کے تاریخی ارتقا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر نہیں آتے، انہوں نے مغرب کی تعبیر کے ذریعے چند مفروضے قائم کر رکھے ہیں، ان مفروضوں کا حقیقت سے بہت کم تعلق ہے۔ مولانا ان مفروضوں پر نقد کرتے اور ان کی تردید تو بہت سلاست اور روانی سے کرتے مگر مغرب سے بے خبری کو علم ونظر ٹھہراتے ہیں، اب اگر یہی مغرب ہے جو مولانا قرار دیتے ہیں، اسے تو کبھی کا خودکشی کر لینا چاہیے تھا، مگر وہ اب تک ہم پر حکومت کیسے جاتا ہے۔

ڈارون کے بارے میں ہمارے ہاں تو یہی مشہور ہے کہ اس نے کہا تھا: انسان بندر سے بنا ہے، اسی پر اکبر الہ آبادی نے ایک قطعہ کہہ دیا اور مولانا ابوالاعلیٰ نے ایک مضمون لکھ دیا، مگر اکبر کا قاری

اورمولانا کا قاری ڈارون سے بے خبر ہے، ڈارون نے فانا اور فلورا پر کام کیا ہے، اور ہزاروں Specis دریافت کیے، اس نے حقیقۃً علم حیاتیات دیا ہے، آپ ایک آدھ مضمون لکھ کر خیال فرمائیں کہ آپ نے اس کی تردید کردی، یہ ایک خیام خیالی کے سوا کیا ہے۔فزکس، ریاضی، کمیسٹری، انجینئرنگ کے ہزار ہا شعبے مغربی تہذیب ہیں۔جدید نظامِ تعلیم اور نظام صحت مغرب کا عطیہ ہے۔ آپ کے مضامین مغرب کا رد نہیں کر سکتے ،مغرب کا استرداد اس وقت ہوگا جب آپ ان کے علوم کو خدا آشنا کریں گے یا ان علوم میں اُن سے آگے بڑھیں گے، یہ تب ہوگا جب کالونیل نظام تعلیم کو چھوڑ کر نیشنل نظام تعلیم تشکیل دیں گے،تقلید کی بجائے تحقیق کی راہ اپنائیں گےاور یہ تب ہوگا جب آپ جامعات سے جبر کا خاتمہ کریں گے،صرف جماعتی وابستگی کی بنیاد پر استاد مقرر نہیں کریں گے، تحقیق اور صرف تحقیق کرنے والے لوگوں کو استاد مقرر کریں گے۔معاشیات اور سائنسز کے استاد، اسلام اور نظریہ پاکستان پر کتابیں لکھیں تو ڈاکٹر رفیق احمد اور پروفیسر خورشید احمد جیسے لوگ سامنے آئیں گے، جنہیں علم معاشیات کے لوگ جانتے بھی نہیں۔

میں نے ۱۹۷۳ سے ۱۹۷۸ء تک پانچ سالوں میں سید قطب اور محمد قطب کی کتابیں بھی پڑھیں لیکن اس لحاظ سے مایوسی ہوئی کہ یہ لوگ مغرب کی نفی کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر یہ مغرب کے نام پر چند مفروضوں کی نفی کر پاتے ہیں، ان لوگوں کی تحریریں سطحی اور یک رخی ہوتی ہیں،نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مولانا مودودی مرحوم تمام عمر مغرب کی نفی کرتے رہے، بیٹے مغرب میں جا آباد ہوئے اور خود مغرب کے نظامِ صحت سے مستفید ہوتے ہوئے دنیا سے عقبیٰ کا سفر کر گئے، ان کی تہذیبی کشمکش کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں کو میں نے ہمیشہ زبانی جمع خرچ خیال کیااور اب بھی خیال کرتا ہوں۔

میں نے مولانا مودودی کو جس سنجیدگی سے پڑھا، اب سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ مولانا کو پڑھ کر مجھے آگے بڑھنے کے تمام راستے مسدود نظر آئے، ان کی کتابیں: مسئلہ ملکیت زمین، اسلام اور جدید معاشی نظریات Statusquo کی نظریہ سازی کرتی نظر آئی اور لطیفہ یہ تھا کہ جماعتِ اسلامی کے لوگ مولانا کے لٹریچر کو انقلابی کہتے تھے اور یہ تو ایسے ہی ہے کہ جیسے مطالعہ پاکستان میں

صرف مسلم لیگ کو آزادی خواہ جماعت کہا جاتا ہے۔ میں نے مولانا کو جتنا زیادہ پڑھا، اتنا ہی احساس شدید ہوتا گیا کہ میں ایک سی باتیں بار بار پڑھ کر وقت ضائع کر رہا ہوں۔

اُن دنوں مجھے اچانک علامہ عنایت اللہ المشرقی کی کتاب تذکرہ ہاتھ آئی، میں نے پڑھا تو ان کے اسلوب نے مرعوب کیا، مگر اس کے تسخیر فطرت کے نظریہ نے متوجہ کیا، یہ بات میں اقبال کی پیام مشرق میں بھی پڑھی تھی، مشرقی کو پڑھتے ہوئے پتہ چلا کہ انہوں نے یہ نظریہ ڈارون سے لیا تھا، میں ڈارون کو نہ تب سمجھا تھا نہ اب سمجھنے کا دعویٰ کر سکتا مگر یہ نظریہ زیادہ عرصہ میرے ذہن پر سوار نہ ہو سکا، مشرقی کو پڑھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ تسخیرِ فطرت اور غلبے کے نظریات کا آغاز مشرقی سے ہوا اور مشرقی نے یہ نظریہ ڈارون کے زیرِ اثر اختیار کیا، مشرقی اپنے تمام نظریات میں ہٹلر کو اسلامی شکل دیتے نظر آتے ہیں، بہرحال میں مشرقی کے ساتھ زیادہ دیر اور دُور تک نہ چل سکا، ان کی بعض باتیں جزواً شاید فائدہ مند ہوں مگر اصولاً وہ بناء الفاسد علی الفاسد کے ذیل میں آتے ہیں۔

میں نے ۱۹۷۳ سے ۱۹۷۸ء تک کے زمانے میں ایم اے اردو، ایم اے سیاسیات کیا ہے، انہی دنوں میں میں نے اپنے والد صاحب سے عربی پڑھنے کی کوشش کی مگر زیادہ آگے نہ بڑھ سکا، میں نے ایم اے اردو کرتے ہوئے کچھ تو اپنی نصابی ضروریات کے تحت اور کچھ اپنے شوق کے تحت اردو ادب کی بعض کتابیں پڑھیں، ان کتب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی غبارِ خاطر میں نے جتنی دفعہ بھی پڑھی، اس سے لطف لیا اور اس کے اسلوب کو ایک منفرد پایا، میں نے یہ اسلوب اپنانے کی کبھی کوشش نہ کی، شاید کوشش کرتا تو اپنا نہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ میں ان کے اسلوب کی نقل کر کے قاری کو بدحظ کرتا، میں نے زیادہ تر آپ بیتی، خاکہ، خطوط اور مزاح کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۹۷۳ء میں میں نے اوکاڑا کے ایک کتب فروش کی دکان سے عبدالمجید سالک کی آپ بیتی "سرگذشت" خریدی، میں نے یہ کتاب بار بار پڑھی، اس طرح ہی تحریکِ آزادی کے مختلف واقعات سے آشنا ہوا، میں نے ایک انگریز مصنف کے ہاں پڑھا تھا کہ مؤرخ کو سوانح نگار کی طرح دلچسپ ہونا چاہیے، میں نے آپ بیتیوں کو پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تاریخ کو آپ بیتیوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ میں نے بہت سے تاریخی واقعات

اپنے باپ سے سن رکھے ہیں، یہ تاریخ کی کسی کتاب میں نہیں ہیں، اس لیے میں زبانی تاریخ کو بہت اہمیت دیتا ہوں، میں نے اسی دور میں احسان دانش کی ”جہان دانش“ خریدی، پڑھی اور لطف لیا اور تاریخ کے بعض پوشیدہ گوشوں سے آشنا ہوا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی ”نقشِ حیات“، مولانا ابوالکلام آزاد کی ”انڈیا ونس فریڈم“ کا ترجمہ ”آزادی ہند“ (محمد مجیب) پڑھی، ان آپ بیتیوں کے ذریعے میں کالونیل دور کی تاریخ سے آشنا ہوا۔

ان دنوں سید قاسم نے مکتبہ شاہکار قائم کیا، انہوں نے رسالہ سائز میں کم قیمت کتابیں شائع کیں، میں یہ کتابیں حاصل کرتا اور پڑھتا، ان کتابوں میں کنیا لال گابا کی کتابوں کے اردو ترجمے ”مجبور آوازیں“ اور ”پیغمبر صحرا“ پڑھے، گابا نے تاریخ کا ذوق بھی پایا تھا، شعور بھی۔ ان کا تعلق کانگریس اور احرار سے رہا تھا، ان کے بارے میں بعض حلقوں کی طرف سے افواہ پھیلائی گئی کہ وہ مرتد ہو کر پھر سے غیر مسلم ہو گئے تھے، یہ کتابیں ان افواہوں کی تردید کے لیے کافی ہیں، قاسم محمود نے انسانی تاریخ اور تہذیب پر بہت سی کتابیں شائع کیں، یہ کتابیں میرے ذہنی افق کو وسعت دیتی رہیں۔

میں نے اس زمانے میں مزاح کا بہت اچھا ذخیرہ جمع کیا اور ان کتب کا دلچسپی اور دل جمعی سے مطالعہ کیا، مجھے ابن انشاء اور مشتاق احمد یوسفی کے اسالیب پسند آئے۔ میں نے مزاح لکھنے کی کوشش کی اور فکاہیہ کالم اور مضامین لکھے، میرے مضامین اور کالم مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے، ترجمان اسلام میں میرا کالم باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا، اس زمانے کی تحریریں محفوظ نہ رہ سکیں۔

میں نے ان دنوں مختار مسعود کی کتاب ”آوازِ دوست“ بہت شوق سے پڑھی، ایک سے زیادہ بار پڑھنے پر بھی یہی بات سامنے آئی کہ ان مضامین کی خوبی جملوں میں ہے۔ ان میں مجموعی طور پر کوئی فکر یا نظریہ نہیں ہے، نہ ہی یہ کتاب کوئی بڑی فکر دے سکتی ہے، یہ بات مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لوگ کسی فکری تکلف کے روادار نہیں تھے۔ وہاں کی خاص بات بیٹھک بازی تھی، جہاں مسلسل گفتگو کی جاتی تھی، ان مجلسوں میں جملے بازی اور جملے سازی کا چلن عام تھا۔ علی

گڑھ کے لوگوں نے اپنی تحریروں میں فقرے بازی اور فقرے سازی کو ادب کی معراج خیال کیا۔ یہ بات رشید احمد صدیقی سے مختار مسعود تک دیکھی جا سکتی ہے، علی گڑھ کے دوسرے ادیبوں میں بھی یہ صفت مشترک نظر آتی ہے۔

میں نے اتفاقاً بعض فرقہ ورانہ کتابیں پڑھیں مگر جلد ہی اس موضوع کو ترک کر دیا، ان کتابوں میں دو قسم کی تحریریں ملتی ہیں، پہلی قسم ان کتابوں کی ہے جو مخالف فرقے پر اعتراضات پر مشتمل ہوتی ہیں، دوسری قسم ان کتابوں کی ہے جن میں ان اعتراضات کے جواب ملتے ہیں، دوسری قسم کی کتابوں میں بہر حال با معنی تحریریں بھی ملتی ہیں اور ان میں معنویت بھی موجود ہے۔ مثلاً قصور کے سید چراغ شاہ مرحوم کی کتاب "راہِ سنت" اس ذیل میں آتی ہے۔ میرے خیال میں وہ کتاب کتبِ اکابر کے بعض مقامات کی اچھی تشریح ہے، پہلی قسم کی کتابوں میں عموماً کمزور اعتراض پایا جاتا ہے۔

فرقہ ورانہ کتب کے مندرجات عموماً مستند نہیں ہوتے، مثلاً علامہ احسان الٰہی ظہیر نے مولانا احمد رضا خان کے ایک استاد مرزا غلام قادر بیگ کو مرزا قادیانی کا برادرِ بزرگ لکھ دیا ہے، حالانکہ مرزا کا برادرِ بزرگ ان پڑھ تھا اور اگر ہو بھی تو کیا مضائقہ ہے، وہ تمام عمر مسلمان رہا تھا، ہمیں اس کے خاتمہ بالایمان کا حسنِ ظن رکھنا چاہیے، یہی حال دوسری جانب کے مصنّفین اور مؤلفین کا ہے، اس سلسلے میں سب سے زیادہ مظلوم تو جماعت مجاہدین کے بزرگ ہیں۔ دوسرے اکابر علماء بھی خاصے مظلوم نظر آتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کے مصنّفین کا استدلال بھی عموماً فرقہ ورانہ نوعیت کی کتابوں جیسا ہی ملتا ہے، مولانا مودودی کے اتباع نے اُن سے یہ طریقہ سیکھا ہے کہ وہ زیرِ تبصرہ نقطۂ نظر کی من چاہی تعبیر کرتے اور اس پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں، حالانکہ یہ تعبیرات عموماً مالا یرضی بہ قائد نوعیت کی ہوتی ہیں، جدید زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مخالف تحریروں کو Define کرنے کا حق اپنے لیے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ وہ اندازِ نقد ہے جس سے کام لیتے ہوئے مولانا مرحوم نے پروفیسر محمد سرور کی کتاب مولانا عبید اللہ سندھی حالات و تعلیمات پر تبصرہ کرتے ہوئے مسترد کیا اور مولانا حسین احمد مدنی کی کتاب متحدہ

قومیت اور اسلام کی تردید اور تغلیط فرمائی، یہ اندازِ نظر قاری کو مستفید نہیں کرتا، اس کا پینڈا کھوٹا کرتا اور وقت ضائع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس طرح کی تحریریں پڑھنے سے عموماً گریز کرتا ہوں۔

ڈاکٹر مبارک علی بہت اچھے مؤرخ ہیں مگر علماءِ دین کی تاریخ ان کا موضوع نہیں ہے، انہوں نے علماء کی تاریخ کو خواہ مخواہ موضوعِ تحقیق بنایا اور پھر بغیر تحقیق کے بنایا، نتیجۃً ان کی تحریروں میں وہی فرقہ وارانہ انداز پیدا ہوگیا، یہی اندازِ تحقیق مسلم لیگی مورخین کا ہے، مثلاً ڈاکٹر صفدر محمود نے صرف شہرت عام کی وجہ سے یہ مان لیا کہ علامہ اقبال نے خط لکھ کر مسٹر جناح کو ہندوستان آنے کی دعوت دی، حالانکہ ایسا کوئی خط اب تک دریافت نہیں ہوسکا، دراصل غلام احمد پرویز نے علامہ اقبال کے خط کی تاریخ بدل کر سارا افسانہ تراش لیا۔ خط ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں لکھا گیا، اس کی تاریخ تبدیل کرنے سے تحریک کو ایک دلچسپ افسانہ مل گیا، جسے مطالعہ پاکستان نے سند عطا کردی۔ اب اس طرح کے افسانوں کو بار بار کون پڑھے، ایسے ہی بعض علماء اپنی بات اس جملے سے شروع کرتے ہیں، میرے والد صاحب نے فرمایا: اب بھلا کون کسی کے والد صاحب کے فرامین کب تک پڑھے، ایسی تصانیف سے راقم مکمل گریزاں ہے، پھر ایسی کتابوں سے گریز لازم ہے جو کسی بڑے عالم نے لکھی، مگر وہ جس علم کے متخصص تھے، اس علم میں نہیں، اس علم میں لکھی جس علم میں وہ صرف طفلِ مکتب تھے۔

۱۹۷۸ء سے پہلے میرا مطالعہ محدود تھا، قصبے میں رہتے ہوئے صرف وہی کتابیں پڑھ سکتا تھا جو دستیاب ہوتی ہیں یا کبھی کبھی لاہور سے خرید کر لاتا، ان دنوں میں نے جو کتابیں پڑھیں اور انہیں بامقصد اور معنویت کی حامل پایا، وہ تھی پروفیسر محمد سرور کی مرتبہ کتابیں: ”مولانا عبیداللہ سندھی حالات و تعلیمات“ اور ”افادات وملفوظات“، اور شیخ محمد اکرام کی کتابیں ”آبِ کوثر“، ”رودِ کوثر“ اور ”موجِ کوثر“، یہ پانچ کتابیں میرے لیے بہت مفید ثابت ہوئیں۔ شیخ اکرام کی کتابیں برعظیم پاک وہند کی سیاسی و ثقافتی تاریخ ہیں، انہیں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ہماری نصابی کتابوں میں کیسی کیسی غلط باتیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ کتابیں میری اُس وقت کی ذہنی سطح کے عین مطابق تھیں، مگر پروفیسر محمد سرور کے کتابوں نے تو

مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ قدم قدم پر نئی باتیں، نیا تجربہ، تاریخ کا نیا شعور، نئی بصیرت، ہر بات کو سمجھنے کے لیے بار بار پڑھنا پڑا۔ ان کتابوں میں ہر تاریخی مظہر کو تسلسل میں اور تمام حوالوں سے دیکھنے کی کوشش ملتی تھی، دوسرے ان میں Complexed باتوں کو ان کی ہر سطح کی تہہ داری اور پیچیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش ملتی تھی۔ مولانا مودودی کو پڑھتے ہوئے زیادہ سوچنا نہ پڑتا تھا، وہ تو زیادہ سے زیادہ جذباتی کرتی تھیں۔ میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں، گہرے تفکر کے بغیر جذبوں کو جگانا بہت خطرناک ہوسکتا ہے۔ یہ کام شاعری میں علامہ اقبال کرتے رہے تھے، نثر میں یہی کام مولانا مودودی کرتے رہے، ان کے ہاں تجزیہ بہت سطحی ہوتا تھا، میں پچیس سال سے کم عمر تھا، مگر ان کے تبصروں اور تجزیوں سے اختلاف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا، میں نے مولانا مودودی کی کتاب "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" پر اختلافی نوٹ لکھے تھے، یہ بعد میں کہیں ضائع ہو گئے۔

۷۸-۱۹۷۳ء کے اس دور میں مَیں نے مغربی سیاسی فکر کا مطالعہ کیا، سیاسی اداروں کو سمجھنے کی کوشش کی اور سیاسی تاریخ کو سمجھنے کے لیے مختلف کتابیں پڑھیں، اس طرح میں نے ادبی تنقید کے حوالے سے حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری"، شبلی کی "شعر العجم" کی آخری جلد، محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات"، سجاد باقر رضوی کی "مغرب کے تنقیدی اصول" اور سلیم اختر کی "تنقیدی دبستان" پڑھیں۔ تاریخ ادب کے حوالے سے رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادبِ اردو" کا مطالعہ کیا، ان کتابوں سے ادب کی تنقید میں یقینا کچھ نہ کچھ مدد ملی، ادبی نظریات سے بھی آگاہی ہوئی اور ادب کو ثقافتی اور تاریخی تناظر میں دیکھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ سیاسی افکار ادب کی تفہیم میں معاون ہوئے اور تاریخی و ثقافتی ادب کی تفہیم و تعبیر کا ذریعہ بنا، میں اب بھی ادب کو ثقافتی اور تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری کتاب "اردو ادب تہذیبی تناظر" میں اسی کوشش کا عملی اظہار ہے۔

میں نے نصاب کے لیے لکھی کتابوں خصوصاً تاریخ و سیاست پر لکھی نصابی کتابوں کو بہت ادھورا پایا، ان کتابوں میں حکمران طبقات کا نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے۔ بی اے سیاسیات کی کتابوں میں اسٹیبلشمنٹ کا اشارۃً تذکرہ بھی نہیں ملتا، یہی وجہ ہے کہ مجازی حکومتوں کو طنز و تنقید کا نشانہ بنایا

جاتا ہے اور حقیقی ہیئت حاکمہ کو نظر انداز بھی کیا جاتا ہے۔ تحسین وتبریک کا ہدف بھی سمجھا جاتا ہے۔ ان نصابی کتب کو گہری نظر سے پڑھا جائے اور ان کتب پر تنقید کو بھی پڑھا جائے تو بندہ برائی کی جڑ تک پہنچ جاتا ہے۔ ایک عالمِ سیاسیات کو معلوم ہونا چاہیے کہ طبقاتی ریاست میں ریاست کے اداروں کا کام بالا دست طبقوں کی حفاظت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح قومی ریاست میں ادارے قومی سرمایہ دار کی حفاظت کرتے اور ملک کو بیرونی قوتوں سے بچاتے ہیں۔ نوآبادیاتی کالونی ریاستوں اور جدید نوآبادیاتی (New Colonial) ریاستوں میں ریاستی ادارے عوام کو غلامی میں مبتلا رکھتے ہیں اور ملک کو غیر ملکی قوتوں کا باجگزار اور فرماں بردار بنانے میں اپنا ہمہ جہتی کردار ادا کرتے ہیں۔ عالمی قوتوں کے وفادار دانشور چاہے مذہبی عالم ہوں یا غیر مذہبی، وہ ملک کو نظریاتی طور پر عالمی قوتوں کا غلام بنائے رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ میڈیم میں مقدس بنا کر پیش کیے جاتے ہیں۔ میں نے سیاسیات کی کتابوں خصوصاً مغربی سیاسی مفکرین پر Sabine اور بارکر کی کتابوں سے بہت کچھ سیکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۷۸ء تک کے دور کے مطالعہ میں میرے لیے مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر محمد سرور، مولانا عبیداللہ سندھی، ڈاکٹر احمد حسین کمال اور چوہدری افضل حق کی کتابیں مذہب و سیاسیات میں، علامہ شبلی نعمانی کی "سیرت النبی" اور افضل حق کی "محبوبِ خدا" سیرت میں، محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات"، شبلی کی "شعر العجم" اور مولانا الطاف حسین حالی کی "مقدمہ شعروشاعری" تنقید ادب میں اور تاریخ ادب میں اہم ثابت ہوئیں۔ میں ان کتابوں کو وقتاً فوقتاً پڑھتا رہا اور ان سے استفادہ کرتا رہا، ان کی کتابیں بعد میں بھی میرے زیرِ مطالعہ رہیں۔

رشید احمد صدیقی ایک مدت تک میرے پسندیدہ نثر نگار رہے، فیض کو میں نے بی اے میں ہی پڑھنا شروع کیا تھا۔ فیض اور ندیم اس دور میں بھی میرے زیرِ مطالعہ رہے۔ میں نے فنون اور اوراق کے دو تین شمارے بھی دیکھے، جنہیں بعد میں مَیں باقاعدگی سے پڑھنے لگا۔



علم وتحقیق

عورت کا مقام اور ذمہ داریاں حدیث کی روشنی میں

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

[ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، (علی گڑھ) پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ اسلامیات کے صدر اور ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ کے ایڈیٹر رہے، آپ کی تحریریں النخیل کی زینت بنتی رہیں گی، ان شاءاللہ۔ ادارہ]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مرد عورت دونوں کی تخلیق اپنی رحمت وحکمت سے فرمائی ہے۔ دونوں کو اپنے دین اور پیغام کا مخاطب بنایا ہے اور دونوں ہی کو اپنے احکام وفرامین پر عمل کرنے کا مکلف بنایا ہے۔ دونوں کو مستقل حیثیت اور ذمہ داریاں عطا فرمائیں۔ کسی کو ایک دوسرے کا نتیجہ اور ضمیمہ نہیں بنایا بلکہ براہ راست دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

مَنۡ عَمِلَ صَالِحاً مِّن ذَكَرٍ أَوۡ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهُۥ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ أَجۡرَهُم بِأَحۡسَنِ مَا كَانُواْ يَعۡمَلُون (النحل:۹۷)

مرد وعورت میں سے جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ہم اس کے اچھے کاموں کا بہترین بدلہ دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔

پروردگار عالم کے اس کریمانہ اعلان سے معلوم ہوا کہ تخلیق کے اعتبار سے، ایمان وعمل کے اعتبار سے اور اجر واکرام کے اعتبار سے مرد وعورت دونوں مساوی ہیں۔ کوئی کسی سے کمتر اور پست نہیں ہے۔ نہ عورت کمتر ہے جیسا کہ مشرکانہ مذاہب نے عقیدہ بنا رکھا ہے اور نہ مرد کمتر ہے جیسا کہ عصر حاضر کی نسوانی تحریکوں کے علم برداروں کی ذہنیت ہے۔ مرد وعورت دونوں ایک دوسرے کے رفیق ہیں،

معین ومددگار ہیں، ہم ساز اور دم ساز ہیں، حریف اور مد مقابل نہیں ہیں۔ جو لوگ اللہ کی قدرت، الوہیت اور نظام آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ یہی یقین رکھتے ہیں اور یہی ان کا نظریہ حیات ہے۔ جیسا کی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (التوبہ:۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔

اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ **النساء شقائق الرجال** (۱) عورتیں مردوں کا جزو ہیں۔ یعنی مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور زندگی کے سفر کو آسان بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے حقوق بھی یکساں طور پر مقرر فرمائے ہیں اور کسی کے حق میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق کو خوشی کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرۃ:۲۲۸)

عورتوں کے مردوں پر وہی حقوق ہیں جو معروف طریقہ سے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں البتہ مردوں کو یک گونہ درجہ دیا گیا ہے (جو نکاح وطلاق اور رجعت سے تعلق رکھتا ہے)

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم زمانہ جاہلیت میں ہم عورتوں کو کچھ بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں احکام نازل کیے اور ان کا حصہ مقرر فرمایا۔ (۲)

تخلیقی طور پر مردوں کے مقابلہ میں عورت نسبتاً کمزور ہے۔ اس لیے اس کی خبر گیری اور معاونت کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے حقوق کی نگرانی اور عزت وعصمت کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ یہ کام مرد کر سکتے ہیں، اس لئے ان کو یک گونہ فضیلت دی گئی ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں خاص طور پر عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کی خبر گیری کرنے کی تاکید فرمائی: **استوصوا بالنساء خیراً** (۳) عورتوں سے حسن سلوک کے بارے میں میری نصیحت قبول کرو۔

جاہلیت کے زمانے میں شوہر اپنی بیویوں کو باندیوں کی طرح مارتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

عورتوں کے ساتھ اس بدسلوکی سے روکا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی بیویوں کو لونڈی، غلام کی طرح نہ مارے۔(۴)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مردوں کی شرافت اور نیکی کا معیار اپنی عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کو قرار دیا ہے۔آنجنابؐ نے ارشاد فرمایا: **خیر کم خیر کم لاھلہ وانا خیر کم لاھلی** (۵) تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی فیملی کے لیے بہتر ہو اور میں تم لوگوں میں زیادہ بہتر ہوں، اپنی فیملی کے لیے۔رسول پاک نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔یہاں تک کہ جنگ کے میدان میں بھی دشمن کی عورتوں پر تلوار اٹھانے سے منع فرمایا۔حضرت ابوعبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میدان جنگ میں کسی عورت کی لاش دیکھی تو آپؐ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔(۶)

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو سیاسی، سماجی، فوجی، معاشی اور انتظامی ذمہ داریوں کا مکلف بنایا ہے اور اللہ کے نزدیک ان معاملات کا جواب دہ ٹھہرایا ہے۔اسی طرح عورتوں کو بھی گھر کے معاملات کا ذمہ دار بنایا ہے اور گھریلو ذمہ داریوں کے بارے میں ان کو جواب دہ ٹھہرایا ہے، حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **المرأۃ راعیۃ علی بیت زوجھا وولدہ وھی مسئولۃ** (۷) عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی ذمہ دار ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اچھی عورت کے لیے تین چیزیں لازم قرار دی ہیں: نیک سیرت ہو، فرماں بردار ہو اور اللہ کی عطا کردہ چیزوں مثلاً عزت، مال اور اولاد کی حفاظت کرنے والی ہو۔قرآن کریم میں وارد ہے:

فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء: ۳۴)

وہ عورتیں نیک ہیں، فرماں بردار ہیں اور اللہ کی حفاظت سے غائبانہ حفاظت کرتی ہیں۔

اسی لیے ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت نیک عورت کو قرار دیا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **الدنیا متاع و خیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحہ** (۸) پوری دنیا ایک نعمت ہے اور دنیا کی بہترین نعمت نیک عورت ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو اپنے شوہر کی وفاداری اور تابع داری کا حکم دیا ہے مگر برے

کاموں میں ان کا ساتھ دینے سے منع فرمایا ہے۔ امام بخاری نے یہ باب قائم کیا ہے: **لاتطیع المرأۃ زوجھا فی معصیۃ** (۹) عورت گناہ کے کاموں میں اپنے شوہر کی اطاعت نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ نے مثالی عورت کی دس صفات گنائی ہیں:

إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِيْنَ اللَّهَ كَثِيْراً وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيْماً (الاحزاب:۳۵)

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔ اللہ سے ڈرنے والے مرد اور اللہ سے ڈرنے والی عورتیں۔ صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں۔ روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں۔ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں۔ اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں۔ اللہ نے ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

مرد و عورت میں ان دس صفات کی موجودگی انسانی معاشرہ کو جنت نشاں بنا دیتی ہے اور ان کو جنت کا حق دار کر دیتی ہے۔ یہاں خاص طور پر عورتوں کی صفات کا الگ سے ذکر کرنا اللہ کے نزدیک عورتوں کے مقام اور ان کی ذمہ داریوں سے باخبر کراتا ہے۔

عورتوں کو ان کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں مردوں کا تعاون ضروری ہے۔ اس کی پہلی شکل یہ ہے کہ ان کو ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت اور تعلیمات سے باخبر کیا جائے۔ ذمہ داریوں کی نزاکت کا احساس دلایا جائے اور آخرت کے حساب و کتاب سے متنبہ کیا جائے، حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب وَأَنذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ (الشعراء:۲۱۴) نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے گھر والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے صفیہ بنت

عبدالمطلب، اے فاطمہ بنت محمدؐ مجھ سے جو مال چاہو طلب کرلو مگر میں اللہ کے سامنے تمہارے لئے کوئی اختیار نہیں رکھتا'' (۱۰)

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَاراً وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (التحریم:٦)

اے ایمان والو اپنے آپ کو اور اپنی فیملی کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

امام مقاتل مشہور تابعی اور مفسر قرآن ہیں، اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی فیملی کو، اپنے رشتہ داروں کو اور اپنے غلاموں اور باندیوں کو اللہ کے احکام اور اس کی منہیات کی تعلیم دے'' (۱۱)

یہ انسان کی فطرت ہے کہ اسے جو ماحول دیا جائے گا اور جیسی اس کی تربیت کی جائے گی وہ اسی کے مطابق ڈھل جائے گا۔ خاص طور پر عورتیں معاشرہ اور ماحول کا اثر زیادہ قبول کرتی ہیں۔ رسم و رواج کو بنانے اور بڑھانے میں ان کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر ان کو پاکیزہ ماحول فراہم کیا جائے گا تو ان کی زندگی میں پاکیزگی آئے گی، آوارگی کا ماحول ملے گا تو ان کی سیرت وکردار میں کمزوری آئے گی۔ اسی لیے معلم انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اپنی فیملی کی تعلیم و تربیت کی تلقین فرمائی اور ان کو اچھا ماحول فراہم کرنے کی نصیحت فرمائی۔ ان کی خامیوں سے درگزر کرنے اور ان کی خوبیوں کو آگے بڑھانے پر توجہ دلائی اور اپنی ذاتِ گرامی کو مثال اور نمونۂ عمل بنا کر پیش کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کی تعلیم وتربیت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ سفر میں بھی ان میں سے کسی کو ساتھ رکھتے تاکہ ان کی مکمل تربیت ہوسکے اور وہ دوسری عورتوں کے لیے نمونہ بن سکیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی فرماتے تھے پھر جس کا نام قرعہ میں نکلتا اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ (۱۲)

دوسری شکل یہ ہے کہ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے۔ لڑکیوں کو ناخواندہ اور بے تربیت نہ چھوڑا جائے ؎

تعلیم لڑکیوں کو بھی دینی ضرور ہے

لڑکی جو بے پڑھی ہو وہ بے شعور ہے

چنانچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص لڑکیوں کے ذریعہ آزمایا جائے اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو وہ لڑکیاں اس کے لیے جہنم کی آگ سے بچانے کا ذریعہ ثابت ہوں گی''(۱۳)

حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جس شخص نے تین بچیوں کی کفالت کی، ان کی تربیت کی، ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو وہ اس کے لئے جنت ہے''(۱۴)

حضرت ابو بردہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کے پاس باندی ہو اور وہ اس کو اچھی تعلیم دے اور اچھا ادب سکھائے، پھر اسے آزاد کردے، اس کے بعد اس سے شادی کرلے تو اسے دوہرا اجر دیا جائے گا''(۱۵)

عام طور پر لوگ بیٹوں کو اچھی تعلیم دیتے ہیں اور اس کی تعلیم پر بڑی رقم خرچ کرتے ہیں مگر بیٹیوں کی تعلیم پر اتنی توجہ نہیں دیتے۔ یہ رویہ سنت رسولؐ کے خلاف ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا: ''جس کے پاس کوئی لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ درگور نہ کرے، نہ اسے کمتر جانے اور نہ لڑکے کو اس پر ترجیح دے تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا''(۱۶)

تیسری شکل یہ ہے کہ خواتین کو ایمان وعمل کی تلقین کرنے کے لیے اور ان کو ذمہ دار اور باوقار بنانے کے لیے خصوصی خطاب اور اجتماعات کا اہتمام کیا جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلسوں میں خواتین بھی شریک ہوتی تھیں اور مردوں کے ساتھ وہ بھی علم دین سیکھتی تھیں۔ اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لیے خصوصی خطاب کا اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عید کے دن خطبہ دیا، آپ نے یہ محسوس کیا کہ عورتوں نے

آپ ﷺ کا خطبہ اچھی طرح نہیں سنا تو آپ ﷺ عورتوں کے درمیان تشریف لائے اور آپ ﷺ نے ان کو وعظ و نصیحت کی اور صدقہ کرنے کا حکم دیا۔(۱۷)

ایک مرتبہ ایک خاتون نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گزارش کی آپ کی مجلس میں مرد حضرات سے عورتیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ آپ ہم عورتوں کی اصلاح و تربیت کا کوئی الگ سے دن مقرر کردیجیے۔ چنانچہ رسول پاک نے ایک دن عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے خاص کردیا۔(۱۸) اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ عورتوں نے اسلام کی اشاعت اور مسلم معاشرہ کی تشکیل میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔

عورتوں کو خصوصیت کے ساتھ شرم وحیا اور عصمت وغیرت کی تعلیم دی جائے۔ موجودہ زمانہ میں مغربی اور مشرکانہ معاشرہ کے غلبہ نے مسلمان عورتوں میں شرم وحیا کا احساس کم کردیا ہے، خاص طور پر وہ لڑکیاں جو عصری تعلیم کی مخلوط درس گاہوں میں پڑھتی ہیں بالعموم ان کے دلوں سے شرم وحیا کا احساس مٹ جاتا ہے۔ تعلیم حاصل کرنا عورتوں کے لیے ضروری ہے، اسی کے ساتھ شرم وحیا اور پاک دامنی کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ خاص طور پر لباس اور وضع قطع میں رسول کریم ؐ کی تعلیمات اور ازواج مطہرات ؓ کے نقش قدم پر چلنا لازم ہے۔ بے حیائی اور بدکاری کی موجودہ وبا سے دامن بچانا مسلمان لڑکیوں کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ روایت کرتی ہیں کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت کرنے والی عورتوں پر اللہ رحم کرے۔ جب اللہ نے یہ آیت نازل کی: **ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن** (الاحزاب:۵۹) تو ان عورتوں نے اپنے پردوں کو پھاڑ کر اپنی اوڑھنیاں اور ڈوپٹے بنالیے۔(۱۹)

شرم و غیرت ہے آبروئے جمال
اے میری شاہد پری تمثال

مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کے لیے نمونہ اور رول ماڈل رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات ؓ، صاحب زادیاں ؓ اور صحابیات ؓ ہیں، آج کی ماڈل گرل نہیں۔ فتنہ اور فساد کے زمانے میں رسول کریم ؐ کی پاکیزہ تعلیمات عام عورتوں کے لیے اور خاص طور پر مسلمان عورتوں کے لیے تحفظ اور تکریم کا

ذریعہ ہیں۔ ان کو اختیار کرنے میں دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔اسی سے عورتوں کو تحفظ ملے گا، خاندان برباد ہونے سے بچے گا اور معاشرہ میں فساد نہیں پھیلے گا۔



حوالہ جات

★...(۱) مسند احمد بن حنبل، جلد ۶، ص ۲۵۶★...(۲) فتح الباری، شرح صحیح البخاری، المکتبہ السلفیہ، القاہرہ، جلد ۱۰، ص ۳۰۱★...(۳) الصحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الوصاۃ بالنساء★...(۴) ایضاً، باب ما یکرہ من ضرب النساء★...(۵) ایضاً، کتاب الجہاد، باب قتل الصبیان فی الحرب★...(۶) سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح★...(۷) الصحیح البخاری، کتاب النکاح، باب المرأۃ راعیتہ فی بیت زوجھا★...(۸) الصحیح لمسلم، کتاب الرضاع، باب خیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحہ★...(۹) الصحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لاتطیع المرأۃ زوجھا ★...(۱۰) الصحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب وانذر عشیرتک الاقربین ★...(۱۱) تفسیر ابن کثیر، سورہ التحریم، آیت ۳۴★...(۱۲) الصحیح البخاری، کتاب الشھادات، باب تعدیل النساء وبعضھن بعضا★...(۱۳) الصحیح البخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ★...(۱۴) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتیما★...(۱۵) الصحیح البخاری، کتاب العتق، باب فضل من ادّب جاریتہ★...(۱۶) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتیما ★...(۱۷) الصحیح البخاری، کتاب العیدین، باب موعظۃ الامام النساء ★...(۱۸) الصحیح البخاری، کتاب العلم، باب ھل یجعل للنساء ویوم علی حدۃ ★...(۱۹) سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی قولہ ولیضربن بخمرھن

میرا سفر

ملتان کا سفر اور حضرت شیخ الاسلام و دیگر اکابر کی زیارت و ملاقات

محمد بشارت نواز

سفر نامہ ادب کی ایک صنف ہے، جس کے لکھنے کا مقصد پڑھنے والوں کو اپنے تجربات و مشاہدات سے واقف کرانا ہے جو ان کی معلومات میں اضافہ کرے لیکن یہ کمترین بندۂ خدا اس صنف میں کیا گل کھِلائے گا اور بھلا اس کے پڑھنے والوں کو کیا نفع ہو گا۔ مگر بڑوں کے حکم کی تعمیل میں پچھلے دنوں پیش آنے والے ایک مختصر سفر کی رُوداد قلم بند کرتا ہوں۔

۷ فروری ۲۰۲۲ء کو وفاق المدارس العربیہ کے مرکزی دفتر میں کچھ ضروری کام کی غرض سے ملتان جانا طے ہوا تو موقع غنیمت جانا کہ اس سفر میں وہاں کی بعض اہم دینی شخصیات کی زیارت و ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو جائے، یہاں (اپنی معلومات کے مطابق) یہ ذکر کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ پاکستان میں کراچی کے بعد ملتان (جسے ایک طبقہ "مدینۃ الاولیاء" کے نام سے یاد کرتا ہے) ایک ایسا شہر ہے جہاں اس وقت نامور اہلِ علم کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے، اور اس سے کئی گنا بڑی تعداد یہاں کی مٹی میں مدفون ہے، جن کی تفصیلات تحریر کرتے ہوئے دسیوں رجسٹر کم پڑ جائیں۔ ملتان اور اس کے گردونواح کا جائزہ لیا جائے تو ملک کے کئی مشہور دینی ادارے اس علاقے میں قائم ہیں جس سے امت کا ایک بڑا حصہ فیض یاب ہو رہا ہے۔ محرومی کی بات ہے کہ ملتان کا سفر ہو اور انسان وہاں کی چند اہم شخصیات کی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل نہ کرے، اس لیے جانے سے پہلے وفاق کے دفتر کے علاوہ تین مقامات منتخب کر لیے گئے اور وہاں رابطہ بھی ہو گیا۔ اللہ بھلا کرے مولانا محمد صاحب کا جو ملتان میں میرے میزبان ہوئے، محمد بھائی انتہائی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سفر کا پروگرام اس طور پر ترتیب دیا کہ کم سے کم وقت میں طے شدہ تمام مقامات پر پہنچ کر تمام ملاقاتیں بروقت ممکن ہوئیں،

آپ معروف مصنف و مترجم مولانا امداد اللہ انور صاحب کے صاحبزادے اور انتہائی ذی استعداد نوجوان عالم دین ہیں، پچھلے سال ابدالی مسجد، ملتان سے درسِ نظامی سے فراغت کے بعد اپنے ادارے "ادارۃ المعارف" میں علمی و قلمی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ان کی معیت میں ملتان کے بڑے اداروں جامعہ خیر المدارس، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی دفتر، ادارہ تالیفات اشرفیہ اور آخر میں وفاق المدارس العربیہ کے مرکزی دفتر جانا ہوا۔

جامعہ خیر المدارس حاضری کا مقصد جامعہ کے مہتمم اور وفاق المدارس کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب دامت برکاتہم سے ملاقات تھی،لیکن ہم جامعہ اس وقت پہنچے کہ آپ وفاق المدارس کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے وفاق المدارس العربیہ کے دفتر تشریف لے جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہورہے تھے،انتہائی مختصر ملاقات ہوئی،آپ نے حکم دیا کہ آپ کسی وقت دوبارہ آیئے ، تفصیلی ملاقات ہوگی۔پھر حضرت قاری صاحب وفاق المدارس کے دفتر تشریف لے گئے۔اس کے بعد خیر المدارس میں ماہنامہ الخیر کے مدیر مولانا محمد ازہر صاحب، جامعہ کے ناظم مولانا عبدالمنان صاحب، ماہنامہ الخیر کے معاون مدیر مولانا محمد زبیر صاحب اور وفاق المدارس کے عربی مجلہ کے مدیر مولانا مختار اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی اور النخیل کی آئندہ آنے والی خصوصی اشاعت "مولانا ابن الحسن عباسی نمبر" کے سلسلے میں مشاورت اور آپ حضرات سے اس خصوصی اشاعت کے لیے مضامین لکھنے کی درخواست کی گئی۔مولانا مختار اللہ صاحب حضرت عباسی صاحب کے شاگرد اور ایک طویل عرصہ تک ان کے علمی کاموں میں رفیق رہے ہیں،اس نسبت سے آپ کے سینے میں حضرت عباسی صاحب کی کئی یادداشتیں محفوظ ہیں،اللہ کرے کہ یہ سپردِ قرطاس ہوجائیں۔

جامعہ خیر المدارس کے بعد عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی دفتر حاضری ہوئی، جہاں شاہینِ ختمِ نبوت مولانا اللہ وسایا صاحب سے ملاقات مقصود تھی لیکن ہمیں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی اور آپ رحیم یار خان کے سفر پر روانہ ہوچکے تھے، البتہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے ناظم اعلیٰ مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری صاحب کی زیارت ہوئی،آپ مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اور صحیح معنوں میں آپ کے جانشین ہیں،آپ نے اپنی ساری زندگی اس عظیم مشن میں کھپادی۔بچپن سے جوانی اور اب بڑھاپا،

سب کچھ اس راہ میں تیاغ دیا۔ آپ اس وقت بے حد علیل ہیں، سارا دن بستر پر لیٹے لیٹے گزرتا ہے، اس کے باوجود آپ بغیر کسی ناغے کے روزانہ صبح سویرے گھر سے جو کہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی دفتر کے قریب ہی واقع ہے، دفتر تشریف لاتے ہیں اور شام تک آنے والوں سے لیٹے لیٹے ملاقات کرتے رہتے ہیں۔ ہم جس وقت حاضر ہوئے تو اس وقت بھی کئی ملنے والے موجود تھے، آپ انتہائی نقاہت کے باوجود آنے والے مہمانوں سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مصافحہ کرتے، ان کی بات سن کر پوری حاضر دماغی کے ساتھ جوابات عنایت فرمارہے تھے، اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ تادیر سلامت رکھے، آپ کا یہ نحیف وجود ہی پہاڑوں کی طرح بھاری اور گھنے بادلوں سے زیادہ سایہ دار ہے۔

اس کے بعد ہم ادارہ تالیفات اشرفیہ حاضر ہوئے، جہاں قاری محمد اسحاق ملتانی صاحب کی زیارت اور ان سے مکتبہ جبریل کے سلسلے میں کچھ مشاورت مقصود تھی، تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو جاری رہی۔ قاری اسحاق صاحب کی ایک صفت جو من کو بھائی کہ آپ کو اکابر و مشائخ سے بے حد لگاؤ اور محبت ہے جو آپ کی گفتگو سے خوب عیاں تھی، آپ کے پاس بیٹھ کر اکابر کی محبت میں اضافہ محسوس ہوا۔ ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ کا شمار ملک کے بڑے کتب خانوں میں ہوتا ہے، مجھے بھی کچھ کتابوں کی خریداری کا موقع ملا۔

اس کے بعد قریب دو بجے ہم وفاق المدارس کے دفتر پہنچے، وفاق المدارس کی مجلس عاملہ کے اجلاس کا علم تو جامعہ خیر المدارس میں ہو چکا تھا، یہاں پہنچ کر علم ہوا کہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تشریف لائے ہوئے ہیں اور اجلاس آپ کی صدارت میں جاری ہے، جس میں ملک بھر کی کئی بڑی اہم شخصیات شریک ہیں۔ یہ سن کر حضرت کی زیارت کا شوق مچلا۔ حسنِ اتفاق دفتر میں جامعہ فاروقیہ شجاع آباد کے استاذ مفتی محمد صدیق مظفری صاحب اور ان کے دوست مولانا محبوب الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوگئی، جو حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم سے ملاقات کی غرض سے تشریف لائے ہوئے تھے، انہوں نے حضرت کے خادم سے وقت بھی لے رکھا تھا، میں نے بھی ملاقات کا شوق ظاہر کیا تو انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانے کی ہامی بھر لی، میری تو خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ دفتر اور بیرون دفتر سیکورٹی بے حد سخت تھی، پولیس اور فوج کے جوان ہر جگہ نظر آرہے تھے، اس سے پہلے کہ اجلاس ختم ہو مجھے دفتر میں اپنے کام نمٹانے تھے، ادھر مشغول ہو گیا۔

عصر کے قریب اجلاس اختتام پذیر ہوا تو ایک ایک کر کے شخصیات میٹنگ روم سے باہر آنے لگیں، باری باری تمام حضرات کی زیارت وملاقات کا موقع ملا، کئی شخصیات سے پہلے ملاقات نہیں تھی، اس وجہ سے انہیں پہچاننا ممکن نہیں تھا، جنہیں میں پہچانتا تھا، ان میں جامعہ دارالقرآن، فیصل آباد کے بانی و مہتمم مولانا قاری محمد یٰسین صاحب اور شیخ القراء مولانا احمد میاں تھانوی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔

آخر میں مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب دامت برکاتہم باہر تشریف لائے تو ان سے اس دن کی دوسری ملاقات ہوئی، میں نے آپ کی خدمت میں حضرت عباسی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "قلم نما" پیش کی، چند منٹ گفتگو ہوئی، حضرت عباسی صاحب کا تذکرہ ہوتا رہا، ایک کام میرے ذمے لگا کر آپ تشریف بھی لے گئے، حضرت قاری صاحب سے ملاقات کے دوران محسوس کیا کہ بیماریوں اور عشروں پر محیط دن رات کی بھاگ دوڑ نے اس شیر کو تھکا دیا ہے اور تھکن کے آثار واضح تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ تادیر سلامت رکھے، ابھی بہت ساری منازل آپ کے قدموں کی منتظر ہیں۔

شام کے پانچ بج چکے تھے، مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں شریک تقریباً سب حضرات تشریف لے گئے، دفتر کا وقت ختم ہونے کی وجہ سے باہر کے تمام لوگ بھی جا چکے تھے، دفتر کے عملے اور سیکورٹی اہلکاروں کے علاوہ ہم چند لوگ ہی باقی بچے تھے کہ ہمیں حضرت کے پاس جانے کی اجازت مل گئی، ہم تینوں افراد دفتر کے مہمان خانے میں داخل ہوئے اور حضرت کے کمرے کے باہر نصب نشستوں پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے، دفتر کا سارا عملہ بھی وہاں آ گیا، قریب ساڑھے پانچ بجے کا وقت ہوگا، جب حضرت کمرے سے باہر تشریف لائے، ہماری نشستوں کے آگے سے گزرے تو میں دم بخود ہو گیا، کیسے یقین آئے کہ مجھے مجدد دِ زماں، پاکستان کی نہیں عالمِ اسلام کی ایک عظیم شخصیت کی زیارت کا شرف حاصل ہو رہا ہے، وہ بھی اتنے قریب سے کہ صرف ایک قدم بڑھاؤں تو حضرت کو چھو سکتا ہوں، چند منٹ بعد آپ تمام عملے سے مصافحہ کر کے واپس اپنے کمرے میں تشریف لے گئے ہم تینوں کو بھی اندر کمرے میں داخلے کی اجازت مل گئی، مظفری صاحب اور محبوب بھائی نے حضرت کو تحائف پیش کیے، مختصر سی نشست رہی، مختصر حال احوال کے بعد آپ کچھ لکھنے میں مصروف ہو گئے، مجال ہے کہ ایک لمحہ بھی ضائع ہو، آخر ہم بہت ساری دعائیں لیے چند منٹ میں واپس ہوئے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سفر وصول ہو گیا۔

یادگارِ زمانہ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ - بحیثیت ادیب وناقد
مختصر جائزہ

مولانا نعیم الرحمن صدیقی ندوی (۱)

[مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی صاحب لکھنؤ کے ایک علمی خانوادے کے قابلِ قدر سپوت ہیں، آپ کی والدہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی نواسی اور ایک نیک خاتون تھیں، آپ صدق فاؤنڈیشن، لکھنؤ کے جنرل سیکریٹری ہیں جہاں سے کئی اہم کتابیں شائع ہوچکی ہیں، زیرِنظر آپ کا مضمون دو حصوں میں شائع کیا جائے گا، ادارہ]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۶/مارچ ۱۸۹۲ء-۶/جنوری ۱۹۷۷ء) کی پیدایش اس دور میں ہوئی جو اپنی عقلیت پسندی کے لیے مشہور تھا۔ وہ بھی اس فضا سے متاثر ہوئے اور تشکیک وارتیاب کے میدان میں مدتوں سراب گردی کرتے رہے لیکن انہوں نے بالآخر اسلام کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی۔ اس کے بعد وہ ایک مصلح اور معلم اخلاق کے روپ میں نمایاں ہوئے۔ انہوں نے اپنے اخلاقی صحیفوں ہفتہ وار ''سچ''، ''صدق'' اور ''صدق جدید'' کے ذریعے ملت کی اصلاح کا کام انجام دیا۔ ان کی تحریروں میں سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ادب کی ہر صنف میں ان کی اسلامیت پوری تابندگی سے بے دار ہے۔ تفسیر اور سیرت نبوی تو خالص دینی موضوعات ہیں، تنقید وتبصرے میں بھی ان کا یہ وصف خاص طور پر نمایاں ہے۔

(۱) nrsiddiqui@rediffmail.com

بحیثیت ادیب: مولانا دریابادی ادب کے سلسلے میں ادب برائے ادب نہیں برائے اصلاح کے قائل تھے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

''صحافت برائے صحافت کی طرح تصنیف برائے تصنیف بھی بحمد اللہ اپنا مقصد کبھی نہ رہا۔ ہر دور میں وہی لکھا جو اپنے خیال وعقیدے مطابق تھا۔ قلم سے وہی ٹپکا، وہی چھلکا جو دل و دماغ کے اندر موجود تھا''۔ (آپ بیتی ص ۲۸۲)

مولانا دریابادیؒ نے بہ توفیق الٰہی خوب لکھا اور اس طرح لکھا کہ مثنوی مولانا رومؒ کا یہ شعر ذرا سی لفظی ترمیم ''درمناجاتم'' کی جگہ ''درمقالاتم'' کے بعد ان کے حال کا غماز ہے ؎

در مقالاتم بہ بیں خون جگر   در جگر افتادہ ہستم صد شرر

یعنی: میرے جگر میں صدہا چنگاریاں دبی ہوئی ہیں اور میرے مقالات کو دیکھو ان سے خون جگر ٹپکتا ہوا ملے گا۔

مولانا دریابادی تصنیف وتالیف کے سلسلے میں چند اہم اور بنیادی اصول تحریر کرتے ہیں:

''تصنیف وتالیف جب خود ایک مستقل آرٹ ٹھہرا تو آرٹسٹ یا فن کار کے لیے لازم ہے کہ اسے ناظرین با تمکین کی طبیعت پر، جبلت پر، نفسیت پر پورا عبور حاصل ہو۔ عبارت دقیق ہو، ثقیل نہ ہو۔ سلیس ہو، سپاٹ نہ ہو۔ سنجیدہ ہو، خشک نہ ہو۔ عام فہم ہو، عامیانہ نہ ہو۔ لطیف ہو، رکیک نہ ہو۔ ٹھوس ہو، ٹھس نہ ہو۔ فکر انگیز ہو، مگر بور کرنے والی نہ ہو۔ پرزور ہو، مگر پُرشور نہ ہو''۔ (ملاحظہ ہو: ص ۲۹۱، انشائے ماجد)

مولانا دریابادی کی ادبی وانشائی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ کے سابق مدیر، مشہور ادیب ومورخ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (متوفی ۱۹۷۴ء) رقم طراز ہیں:

''اردو زبان وادب میں مولانا کی حیثیت امام ومجتہد کی ہے، ان کا فطری ذوق ادب وانشا ہے اور وہ ان کی طبیعت میں اتنا رچا اور بسا ہوا ہے کہ ان کی کوئی تحریر بھی اس سے خالی نہیں ہوتی، عطر کسی چیز کا بھی ہو، اس کی زمین ہمیشہ چنبیلی کے پھولوں کی ہوگی، اسی طرح مولانا کی خالص مذہبی، تبلیغی اور اصلاحی تحریریں بھی ادب میں بسی رہتی ہیں اور عروس ادب کا جمال ''حجاب شرعی'' میں بھی نہیں چھپتا، مگر اس کا اصلی کمال ادبی مضامین میں نظر آتا ہے

اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان وادب کا یہ ذوق اقلیم ادب پر حکم رانی، زبان کا یہ لطف اور ادب وانشا کی یہ لطافتیں اب کہنہ مشق ادیبوں میں بھی خال خال نظر آتی ہیں''۔
(تبصرہ بر''انشائے ماجد'' حصہ دوم مشمولہ ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ، بابت ماہ جون ۱۹۶۲ء، عدد ۶، جلد ۸۹)

شاہ صاحب اپنے مضمون ''مولانا کے دو ادبی شاہ کار'' میں مولانا دریابادی کی ادبی حیثیت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی قلمی فتوحات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ فلسفہ و معقولات سے لے کر مذہب وتصوف اور ادب تک مختلف اصناف میں ان کے بلند پایہ مضامین اور مختلف تصانیف موجود ہیں لیکن وہ اصلاً ادیب ہیں اور ان میں ادب وانشا کا ذوق اتنا رچا اور بسا ہوا ہے کہ ان کا امتیازی وصف بن گیا ہے جس سے ان کی مذہبی اور فلسفیانہ تصانیف بھی خالی نہیں۔ زبان وادب کے ہر پہلو پر ان کو حکم رانی بلکہ صاحب قرانی حاصل ہے اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پرانے کلاسیکی ادب میں جو خصوصیات الگ الگ پائی جاتی تھیں، وہ مولانا میں یک جا نظر آتی ہیں۔ سنجیدہ علمی ادب، لطف زبان، روزمرہ، طنز وظرافت اور ضلع جگت سب پر ان کے قلم کی حکم رانی یکساں ہے۔ اس لحاظ سے وہ اس دور کے سب سے بڑے ادیب ہیں''۔ (ملاحظہ ہو ص: ۱۳۳، ماہ نامہ فروغ اردو لکھنؤ مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر۔ اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء)

بے لاگ مبصر، مشہور صحافی اور ادیب ماہر القادری (متوفی ۱۹۷۸ء) سابق مدیر ماہ نامہ فاران کراچی مولانا دریابادی کی ادبی حیثیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''علم وادب میں مولانا موصوف کی متعدد حیثیتیں ہیں۔ وہ فلسفی ہیں، معلم اخلاق ہیں، مترجم ہیں، مصنف ہیں، تنقید نگار ہیں، مفسر اور مبلغ ہیں اور اپنے دور کے سب سے بڑے ''طنّاز'' ہیں۔۔۔ مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب طرز ادیب ہیں، ان کی تحریریں انشا پردازی سکھاتی ہیں۔ ''ادب عالیہ'' کی تعریف ان کی تحریروں پر صادق آتی ہے۔ زبان، ادب اور اخلاق، غرض ہر اعتبار سے وہ مصلح انشا پرداز اور معمار ادب ہیں۔

میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ کی کتابوں اور

تحریروں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اوران کی خوشہ چینی کی ہے‘‘۔

(ص:۱۷۷، ۱۸۰ حوالہ سابق)

معروف مزاح نگاراحمد جمال پاشا (متوفی ۱۹۸۷ء) سابق نائب مدیر روزنامہ قومی آواز لکھنؤ مولانا کی انشا اوراسلوب کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

’’صاحب ’’صدق‘‘ کا نثری اسلوب موضوع کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اپنی مذہبی، دینی تحریروں اور تفسیر القرآن میں ان کا انداز عالمانہ، وقیع اور پر شکوہ ہوتا ہے، لیکن سادگی اور سلاست کے ساتھ۔ عالمانہ، فلسفیانہ اور تحقیقی مضامین میں وہ ایک عالم، ایک فلسفی یا ایک محقق کی شان تصنیف برقرار رکھتے ہیں۔ اپنی ادبی اور صحافتی تحریروں میں وہ سادگی اور سلاست سے کام لیتے ہیں۔ ان کے نپے تلے جچے، چھوٹے چھوٹے جملے، برجستہ فقرے، محاورے، اشعار اور مصرعے، تراکیب، بولتے ہوئے رواں دواں الفاظ۔ پھر الفاظ بھی کیسے کہ جو لفظ جہاں رکھ دیا، ہٹائے نہیں ہٹ سکتا۔ انگشتری میں نگینے کی طرح اپنی جگہ چمکتا ہے۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عبارت چست اور متحرک ہوتی ہے۔ جامد اور بے جان نثر، ڈھیلی ڈھالی اور پھیکی تحریر کا اس بستان ادب میں گزر نہیں۔ یہاں شوخی و تازگی ہے، تراوٹ اور جدت ہے۔ ندرت اور ایجاز ہے، طباعی ہے، حکیمانہ اپج ہے۔ سرخی ایسی جمائی جاتی ہے کہ طبیعت پھڑک اٹھے، چٹکی ایسی ہوتی ہے کہ بے اختیار تڑپنے والے کے منھ سے واہ! واہ! سبحان اللہ! نکل جائے‘‘۔ (حوالہ سابق، ص:۱۶۰)

زیر نظر مضمون میں مولانا دریابادیؒ کی ادبی تحریروں کے چند نمونے پیش ہیں:

اللہ تعالیٰ کے بے شمار بندے حج کرنے جاتے ہیں۔ مولانا دریابادیؒ نے بھی توفیق ایزدی سے حج کیا۔ اس حج کا سفرنامہ جو ’’سفر حجاز‘‘ کے نام سے شایع ہوا اپنی خصوصیات ومحاسن کے اعتبار سے انشائے ماجد کا بہترین نمونہ ہے۔ مولاناؒ نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے:

’’کعبہ کی تجلیات ربوبیت آج بھی وہی، مدینہ کے انوار رسالت آج بھی وہی، بندوں کے سروں میں سودائے عبدیت وہی، افراد امت کے دلوں میں ہوائے شوق وہی۔ کتاب اصلاً نمونہ ٹھہری خوشی وتاثرات کا۔‘‘

خشیت الٰہی اور گناہوں کے احساس نے حج کے اس ماجدی سفرنامہ میں ایک انوکھی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ پڑھتے جایئے اور آپ کو محسوس ہوتا جائے گا کہ لکھنے والا رحمت خداوندی کی طلب میں کس قدر بے چین ہے۔مولانا تحریر کرتے ہیں :

''شانِ کریمی کے حوصلے دیکھنا کیسے نامہ سیاہ کو نوازا جارہا ہے۔کس ننگ خلائق کو سرفراز کیا جا رہا ہے...... مولیٰ ہر بے کس کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے! ہر مفلس کا آسرا تیرا ہی دست کرم ہے، تو اپنے در سے محروم نہ واپس کرنا...... بیت کے ساتھ رب البیت کے انوار جمال کی بھی جھلک اپنے ظرف وبساط کے لائق نصیب ہو! مُردوں کو جلانے والے مالک! مایوسوں کو خوش خبری دینے والے مولیٰ! بے کسوں کی دستگیری کرنے والے آقا! دلوں کے زخم پر مرہم رکھنے والے پروردگار! تجھ سے بھاگا ہوا تیرا نافرمان غلام تیرے اور تیرے حبیبؐ کے آستانہ پاک پر سر رکھنے کو حاضر ہو رہا ہے۔ دعاؤں کا قبول کرنا تیرے ہی ہاتھ ہے اور دعاؤں کی توفیق دینا بھی تیرے ہی ہاتھ میں۔''

مولانا دریابادیؒ کی سیرت نگاری کا ایک نمونہ، یہ اقتباس ان کی کتاب ''ذکر رسول'' سے لیا گیا ہے:

''مکہ کے بے کس و بے کس یتیم، غار حرا میں مراقبہ کرنے والے گوشہ نشین! دیکھ لی تیرے مرتبے کی بلندی دیکھ لی۔ تیری شان محبوبیت کا نظارہ کرلیا۔خادموں اور غلاموں ہی نے نہیں، منکروں اور حاسدوں ، بدباطنوں اور کورچشموں تک نے تیرے آفتاب اقبال کی چمک دیکھ لی۔جو تجھ سے ٹکرایا مٹادیا گیا، توڑ دیا گیا، پاش پاش کردیا گیا۔جو تیرے سامنے جھکا نوازا گیا، سرفراز ہوا اور اپنی مراد کو پہنچا۔ابوجہل اور فرزند خطاب دونوں تیرے حق میں یکساں تھے۔ابوجہل نے تجھ سے دشمنی کی، اپنے آپ سے دشمنی کرلی۔عقل ودانش، نیک نامی واقبال مندی، آفتاب وماہتاب، زمین وآسمان سب اس کے دشمن ہو گئے۔فرزند خطاب نے اپنا سر تیرے آگے جھکادیا، سب اس کے آگے جھک گئے۔خزانے جھکے، فوج و لشکر جھکے، اقبال وحشم جھکا، ناموری واقبال مندی جھکی، شام وایران، مصروعراق کے تخت و تاج جھکے، ایک عالم کا عالم صولت فاروقی کے آگے جھک گیا۔(صفحہ ۸۴)

مولانا دریابادیؒ نے ''حکیم الامت-نقوش وتاثرات'' اور ''محمد علی-ذاتی ڈائری کے چند ورق''

کے نام سے دو کتابیں لکھ کر اردو کے سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

ایک اقتباس ”حکیم الامت-نقوش وتاثرات“ سے، جو رقت آفرینی اور حسرت سامانی میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ موقع ہے مسترشد دریابادیؒ کا مرشد تھانویؒ کے مزار پر حاضری کا:

”تھانہ بھون کی حاضری اس ۱۵ برس کے عرصہ میں خدا جانے کتنی بار ہو چکی تھی۔ آج کا سفر ان سارے سفروں سے کتنا مختلف تھا! ہر بار کتنا اشتیاق ہوتا تھا، کیسا قوی اور کامل یقین کہ دکان کھلی ہوئی ہے، مطب گرم ہے، جاتے اور پہنچتے ہی مرہم شفا ہاتھ میں ہوگا۔ ہر درد کی دوا، ہر فکر و غم سے تشفی! آج رت بدلی ہوئی تھی، آج قسمت پلٹی ہوئی تھی۔ دکان بند، مطب اجاڑ، شفا کے بجائے حسرت شفا! دوا کی جگہ دوا کی یاد! مکین کے عوض صرف مکان!......

خوش گوار یادوں کا محفوظ رہ جانا بھی اللہ کی کتنی بڑی رحمت ہے!

۱۵ برس کا خوب جانا پہچانا ہوا، پچاسوں بار کا چڑھا اترا ہوا، اسٹیشن آج کچھ اجنبی سا تھا۔ ہر بار حضرت کا کوئی خادم اسٹیشن پر عزت افزائی کے لیے موجود ہوتا تھا اور ایک آدھ بار تو حضرت نے کرم کی حد کر دی تھی کہ بہ نفس نفیس تشریف لے آئے تھے۔ آج یہ سب خواب و خیال تھا۔ اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا، پورے دو فرلانگ بھی تو نہیں۔ اور مزار؟ آہ مزار! نہ کوئی بلند گنبد، نہ کوئی کلس دار قبہ، نہ چار دیواری، نہ ”آستانہ“ نہ جنگلہ، نہ کٹہرا۔ ایک اوسط درجے کی وسعت کا باغ۔ ایک سمت میں ایک مختصر پر فضا عمارت۔ وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ اور وہی اللہ کے اس شیر کی خواب گاہ! نہ شامیانہ نہ چھت، صرف آسمان کی کھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تربت! سادگی کی تصویر، صاحب قبر کی بے نفسی کا آئینہ! نہ لوح نہ کتبہ، نہ پھول نہ چادر۔ چند قدم کے فاصلے پر وصل بلگرامی مرحوم اور دوسرے مخلصین پیشوائی کے شوق میں پہلے ہی سے پہنچے ہوئے۔ شیخ کی قبر ان قبروں سے بھی پست!“ (صفحہ ۶۱۱)

سوانح نگاری کے باب میں مولانا دریابادیؒ کی دوسری لائق رشک علمی کاوش ”محمد علی-ذاتی ڈائری کے چند ورق“ سے ایک اقتباس:

”شب برأت ایک خیر و برکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی کہ شب، شب قیامت یا نمونۂ

شب قیامت بھی بن سکتی ہے۔ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اب کی اسی رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا۔ زندگیاں مانگتے ہیں، صحت کے لیے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اس وقت اسے اٹھالیا جائے گا جس کے وجود سے ملت اسلامیہ کا وجود تھا۔ جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی اور جس کی موت اللہ کا نام جپنے والوں کی موت، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے۔ اس پچھلے زمانے میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری۔ کیسے کیسے اکابر اٹھا لیے گئے۔ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا۔ انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا، ترکوں پر ''اتحادیوں'' کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ وبالا ہوا، عراق میں خاک اڑی، مصر کا سردار اٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی، یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا۔ ایک محمد علی کا دم ہر زخم کے لیے مرہم تھا۔ ہر تازہ صدمے کے وقت دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی تو اس خیال سے کہ کچھ بھی چلا جائے محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ! شعبان ۱۳۴۹ھ کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا۔ اور جس پاک و بے نیاز نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یہ منادی کر دی تھی کہ ''وما محمد الا رسول قد خلت من قلبه الرسل أفائن مات اوقتل انقلبتم علی اعقابکم'' اس کے فرشتوں نے بندوں تک محمدؐ کے ایک وفادار غلام محمد علی کے لیے بھی یہی صدا پہنچادی۔'' (صفحہ ۵۶۴-۵۶۵)

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبائے قدیم کے سالانہ جلسے میں مولانا نے جو خطبہ دیا، وہ ''ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دارالعلوم'' کے نام سے شایع ہوا ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''رحمتیں اس مکان کے در و دیوار پر۔ رحمتیں اس چمن کے صحن و سبزہ زار پر۔ رحمت ان پر جنہوں نے اس رحمت و سلامتی کی یہ سبیل لگادی۔ رحمت اس کے پینے والوں پر، رحمت اس کے پلانے والوں پر، رحمت جوانان جرعہ نوش پر، رحمت پیران مے فروش پر!'' (صفحہ ۷)

نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی ''زہر عشق'' پر تبصرہ کا اختتام یوں کرتے ہیں:

''مشرق کے بدنام سخن گو، اردو کے بدنام شاعر رخصت! تو درد بھرا دل رکھتا تھا تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی، تو نے موت کو یاد رکھا، تیرے نام پر بھی موت نہ

آنے پائے گی۔ تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا، شائد کسی کی رحمت بے حساب پر تکیہ کر کے لیکن انہی غافلوں اور سرمستوں کو موت وانجام کی یاد دلا کر بھی خوب رلایا۔ کسی کی عظمت بے پایاں کا خوف کر کے۔ عجب کیا کہ خدائے آمرزگار، اس عالم کا ستار اور اس عالم کا غفار تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامن عفو ومغفرت کے سائے میں لے لے اور تیرے کلام کے درد وعبرت، تیرے بیان کے سوز وگداز کا اجر بھی تجھے عطا کرے۔ اپنی ہی رحمت بے نہایت کی مناسبت سے، اپنے ہی کرم بے حساب کے حساب سے!''

(انشائے ماجد، صفحہ ۱۳۹)

مشہور ادیب مولانا ابوالکلام آزادؒ کے سلسلے میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر اپنی تقریر میں مولانا دریابادیؒ نے ان کو درج ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا :

''ادب عالیہ یا کلاسکس کی اصطلاح تو اردو میں بعد کو چلی ہے۔ باقی یہ کلاسکل یا عالی قدر ادب تو مولانا کا جیسے حصہ تھا۔ ان کے قلم کا شروع ہی سے ایک امتیازی خاصہ تھا۔

تیور مردانہ، لہجہ شریفانہ، ترکیبوں میں جزالت، الفاظ میں جلالت، تشبیہوں میں جدت، استعاروں میں ندرت، خیال میں بلندی، بیان میں صفائی، مطالب فکر انگیز، اسلوب ولولہ خیز، نثر ہر جگہ ادیبانہ، کہیں خطیبانہ، خطابت کا مزاج شاہانہ، عبارت کی سطح کہیں حکیمانہ، کہیں حاکمانہ، حکمت کی جگہ حکمت، ظرافت کی جگہ ظرافت، حکایت غم وحزن ہو یا داستان سرور ونشاط، لطافت وشادابی سطر سطر سے عیاں اور آمد اور بے ساختہ پن لفظ لفظ سے نمایاں۔ مطالعہ میں گہرائی، مشاہدہ میں گیرائی، بات میں بات پیدا کرنے کا وہ سلیقہ اور معمولی جزئیات سے دوررس نتائج نکالنے کا وہ ملکہ کہ دھوکہ حضرت رومیؒ کی مثنوی کے دفتروں کا ہونے لگے۔''

(نشریات ماجد، جلد دوم، صفحہ ۱۷)



کارِ جہاں بینی

اجالے کے لیے جالے اترنا ضروری ہے

وسعت اللہ خان

جامعہ کراچی کے سابق وائس چانسلر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی نے کچھ عرصے پہلے یہ قصہ سنایا کہ مرحوم حکیم محمد سعید نے جب کراچی کے مضافات میں مدینۃ الحکمت کے نام سے ایک علمی شہر بسایا تو سب سے زیادہ توجہ اس شہرِ علم کے کتب خانے ''بیت الحکمت'' پر دی۔ میں حکیم صاحب کے جمع کردہ کتابوں کے اس عظیم الشان ذخیرے کو دیکھ کے خاصا متاثر ہوا تو حکیم صاحب کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ کہنے لگے، پیرزادہ میں اتنا بڑا کتب خانہ صرف کچھ لوگوں کی علم سے بے بہرہ ناخلف اولاد کی مہربانیوں سے ہی بنا پایا ہوں۔

میں نے حکیم سعید کی جانب تکتے ہوئے پوچھا کیا مطلب؟ کہنے لگے کہ پیرزادہ جب میں نے سنا کہ فلاں فلاں صاحب کے مرتے ہی ان کے اہلِ خانہ نے پہلے تو ان کے کتابوں کے ذخیرے کو اپنے گیرج، بیسمنٹ، انیکسی یا سرونٹ کوارٹر میں منتقل کر دیا اور پھر ایک دن کوئی پرانی کتابوں کا سوداگر انھیں تول کر بیس پچیس ہزار میں لے گیا اور پھر پورا کتب خانہ ریگل کے فٹ پاتھ پر کتاب در کتاب بکنے کے لیے رکھ دیا گیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ ایسے تمام عاشقانِ کتب کی فہرست بنوائی جائے جن کی عمر ساٹھ پینسٹھ برس سے زائد ہے۔ اور پھر چند علمی جاسوسوں کی ڈیوٹی لگائی کہ جونہی ان میں سے کوئی اس جہان سے کوچ کرے۔ اس کا کتب خانہ منہ مانگے داموں خرید لیا جائے، اس سے پہلے کہ وہ ٹھیلوں اور فٹ پاتھوں پر منتقل ہو جائے۔ چنانچہ تم جس کتب خانے کو میرا کارنامہ سمجھ رہے ہو بخدا اس میں میرا حصہ اتنا ہے کہ میں نے ان یتیم و بے سہارا کتابوں کو ایک چھت فراہم کر دی ہے اور بس۔''

کتابوں کی خریداری اور ان کی قدر کا رونا اپنی جگہ۔ لیکن اس عادت کی حوصلہ افزائی کے لیے پبلشرز

اور بک اسٹورز بھی کتابی میلوں کے علاوہ شائد ہی کسی پڑھنے والے کو دس فیصد سے زائد رعایت دیتے ہوں۔ کچھ نجی اشاعت کار ممبر شپ اسکیم کے تحت پندرہ فیصد تک رعایت دیتے ہیں البتہ کتابوں کی اشاعت کا سرکاری ادارہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اپنی شایع کردہ کتابوں پر پچاس سے پچپن فیصد رعایت دیتی ہے۔

مگر یہ سرکاری ادارہ بھی محدود بجٹ کے سبب تمام اہم موضوعات پر کتابیں شایع کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ لہٰذا ضرورت کسی ایسے ادارے کی ہے جس کا کام صرف یہ ہو کہ وہ دیگر عالمی زبانوں کی تعلیمی و سائنسی و ادبی کتابوں اور تحقیق کو اردو میں شایع کرے۔ اس باب میں ہمارے بزرگ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمے کے قصے آہیں بھر بھر کے سناتے ہیں جہاں جوش صاحب اور مولانا مودودی جیسے اکابرین نے بھی وقت گذارا۔ نظام شاہی کے اس دارالترجمہ کی شہرت یہ تھی کہ اس دور میں جو بھی دستیاب اہم سائنسی و غیر سائنسی لٹریچر باقی دنیا بالخصوص یورپ میں شایع ہوتا تھا، اس کا اردو ترجمہ حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ میں فوراً کتابی شکل میں شایع کرتا۔ یوں سو برس پہلے عثمانیہ یونیورسٹی برصغیر کا واحد علمی ادارہ تھا جہاں جدید سائنسی علوم کی تدریس بھی اردو میں ہوتی تھی۔

ویسے بھی ترجمے کا فن مسلمانوں کی میراث ہے۔ مغرب کے دورِ جہالت میں دبے قدیم یونانی لٹریچر کو اگر آٹھویں، نویں اور دسویں صدی کے عرب مترجم دستیاب نہ ہوتے تو شائد یونان کا علمی چہرہ سامنے ہی نہ آتا اور پھر جانے مغرب کا علمی انقلاب اور کتنی صدیاں آگے کھسک جاتا۔

میری نسل کو اگر ماسکو اور بیجنگ کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھروں میں ترجمہ شدہ روسی و چینی لٹریچر سستے داموں میسر نہ آتا تو شائد ہم لوگ کنوئیں کے مینڈکوں کی طرح برِصغیری ادب کے گرد ہی گول گول گھوم رہے ہوتے۔

چند برس پہلے پراگ میں چار ماہ گذارنے کے سبب مجھے احساس ہوا کہ کسی بھی معاشرے کو ذوقِ مطالعہ میں جکڑنے اور اسے باقی دنیا کے علمی رجحانات سے جوڑنے کے لیے فوری اور معیاری ترجمہ کتنا اہم ہے، بتایا گیا کہ چیک ری پبلک کی آبادی سوا کروڑ کے لگ بھگ اور خواندگی کا تناسب ننانوے فیصد ہے صرف پراگ میں کتابوں کی اسی سے زائد بڑی دوکانیں ہیں اور ان میں نصف کتابیں وہ ہیں جو پچھلے

ایک برس کے دوران دنیا کی مختلف زبانوں میں شایع ہوئیں اوراب چیک زبان میں دستیاب ہیں۔

پاکستان میں لوگ بھلا ایک دوسرے کو کیسے جانیں جب کہ بین الاقوامی علمی کام تو رہا ایک طرف، علاقائی زبانوں کا نوے فیصد لٹریچر نہ تو قومی زبان میں اور نہ ہی کسی دوسری علاقائی زبان میں منتقل ہو پایا ہے۔اگر کسی نے اپنے طور پر اکا دکا چیزوں کا ترجمہ کر بھی دیا ہے تو اس کی یہ کوشش اونٹ کے منہ میں زیرے سے زیادہ کچھ نہیں۔ بہت اچھی بات ہے کہ یہاں اقبالیات پر ایک پورا ادارہ کام کر رہا ہے، مقتدرہ قومی زبان میں ڈکشنری کے ایک ایک لفظ پر پسینہ بہہ رہا ہے اوراب ڈجیٹل دور کے شایانِ شان کام ہو رہا ہے۔اردو سائنس بورڈ غیر سائنسی متروک کتابیں نکال کے لا رہا ہے۔مجلسِ ترقی ادب اپنی بقا کے جواز کے لیے چھوٹی موٹی تقریبات کرتی رہتی ہے۔ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز بھی کلاسیکل ادب کو ری سائیکل کرنے میں دلچسپی لیتی ہے۔لیکن اگر نہیں ہے تو قومی دار الترجمہ نہیں جو پاکستان کے علاقائی ادب اور خود پاکستان کو بین الاقوامی علمی و مطالعاتی نقشے میں رکھ سکے۔

عام لوگ بالخصوص نئی نسل مطالعے کی پیاسی ضرور ہے لیکن اردو میں اسے زیادہ تر ری سائکلڈ یا مذہبی لٹریچر ہی دستیاب ہے۔یقین نہ آئے تو کسی بھی کتابی نمائش میں چلے جایئے۔ہاں انگریزی کی کتابیں مہنگی ہونے کے باوجود فروخت ہو رہی ہیں۔ کیونکہ اچھے انگریزی میڈیم اسکولوں اور مطالعہ دوست مڈل کلاس اقلیت میں اپنے بچوں کو جدید لٹریچر سے جوڑنے کا رجحان معاشی آسودگی کے سبب پہلے کی نسبت زیادہ فروغ پا رہا ہے۔اور کتابی میلوں کے فیشن اور ان میلوں میں معروف مصنفوں کی شرکت اور انھیں سننے اور ملنے کا گلیمر اس رجحان کو بڑھانے میں خاصا کردار نبھا رہا ہے، لیکن جو بچے اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھنے پر مجبور ہیں اور جن کے والدین کے معاشی حالات بھی زیادہ بہتر نہیں۔ان کے لیے زنگ آلود گرد سے اٹے شیلفوں والی اسکولی و پبلک لائبریریاں ہیں۔ جہاں آخری کتاب شائد انیس سو اڑسٹھ میں خریدی گئی ہو۔ہاں مگر لاڑکانہ کی سر شاہنواز بھٹو لائبریری میں آج بھی صبح دروازہ کھلنے سے پہلے طلبا اور سینئر سٹیزنز کھڑے ہوتے ہیں کہ کب دروازہ کھلے اور کب وہ اندر جا کے کرسیوں پر قبضہ کریں تا کہ دن بھر مطالعے کے لیے بیٹھنے کی جگہ مل سکے۔یہی حال بہاولپور کی پبلک لائبریری کا بھی دیکھا اور جی خوش ہو گیا۔مگر یہ جی ہر نجی اشاعت گھر اور ہر پبلک لائبریری میں جا کر کب خوش ہو گا؟

کتابیں ہیں چمن اپنا

تشنہ لبوں کا نخلستان۔۔۔آسان تفسیرِ قرآن

سید عدنان کریمی

سات دہائی اُدھر کی بات ہے، ریڈیو پاکستان کی جانب سے دینی و مذہبی سیگمنٹ کے لیے روزانہ درسِ قرآن کے متعلق فرمائش کی گئی جس کو چند اعذار کی بنا پر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، کچھ عرصہ بعد انتظامیہ کی جانب سے ایک دوسری تجویز پیش کی گئی کہ روزانہ درس کے سلسلہ سے ہٹ کر ایک ہفتہ واری سلسلہ شروع کیا جائے جس میں پورے قرآن کی تفسیر پیشِ نظر نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کی موجودہ ضرورت کو مدّنظر رکھتے ہوئے منتخب آیات کی تفسیر اور اس سے متعلقہ احکامات بیان کیے جائیں۔ سابق مفتی اعظم پاکستان نے مذکورہ پیشکش کو اس شرط کے ساتھ قبول کرلیا کہ درس کا کوئی معاوضہ ہوگا اور نہ ہی ایسی کوئی پابندی قابلِ قبول ہوگی جو درسِ قرآن کے شایانِ شان نہ ہو، شرط منظور کر لی گئی۔

جولائی ۱۹۵۴ء میں یہ درس "معارف القرآن" کے نام سے شروع ہوا اور تقریباً گیارہ سال پابندی سے جاری رہا۔ جون ۱۹۶۴ء میں ریڈیو پاکستان کی نئی پالیسی کے تحت اس درس کو ختم کر دیا گیا۔ یہ درسِ معارف القرآن تیرہویں پارے کے سورۃ ابراہیم پر اختتام پذیر ہوا، گو کہ اس میں مکمل تیرہ پاروں کی تفسیر نہ تھی، البتہ عامۃ الناس کے لیے ایک معتد بہ حصہ اس ریڈیائی درس میں سما گیا تھا۔ جس وقت یہ کام شروع ہوا تو کسی کے حاشیہ خیال میں نہ تھا کہ یہ ریڈیائی دروس آگے جا کر مستقل تفسیر کی صورت اختیار کر جائیں گے، تاہم قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہفتہ واری درس کے آغاز سے ہی لوگوں نے اسے بڑی پذیرائی بخشی اور پورے ہفتے اس درس کا شدت سے انتظار ہونے لگا۔ ملک اور

بیرون ملک بسنے والے مسلمانوں کی طرف سے بے شمار خطوط ریڈیو پاکستان اور مدرّس مفتی محمد شفیع عثمانی کوموصول ہوئے، جس سے اندازہ ہوا کہ بہت سے دین دار اور نو تعلیم یافتہ مسلمان طبقہ اس درس سے بڑا شغف رکھتا ہے چنانچہ ہر طرف سے اس بات کا تقاضا شدت اختیار کرنے لگا کہ ان دروس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ لوگوں کے اسی اشتیاق اور مانگ کے پیشِ نظر سابق مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی نے معارف القرآن کی تکمیل پر کام شروع کیا۔ وقفہ وقفہ سے کام جاری رہا، مفتی صاحب کی علالت کے دوران ان کے فرزند ارجمند نے بھی چند سورتوں پر کام کیا، یوں اکتوبر ۱۹۷۲ء کو یہ مبارک تفسیری کام مکمل ہوا جس کی ابتدا ریڈیو دروس کی ریکارڈنگ سے ہوئی اور تکمیل ایک علمی کام "معارف القرآن" پر ہوئی۔

والد گرامی کے حکم کی تعمیل میں سورۃ صافات، سورۃ ص اور سورۃ زخرف کو مفسر موصوف کی طرز پر لکھنے والے برخوردار نے لگ بھگ نصف صدی کے بعد محسوس کیا کہ ایک طرف سرکاری اور انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیمی معیار کے انحطاط کے باعث نوجوان نسل کا فصیح اردو سے رشتہ کٹ کر رہ گیا ہے جبکہ دوسری جانب مروجہ تراجم و تفاسیر میں اس قدر فصاحت و بلاغت ہے جس کا سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ نوجوان نسل اور عام مسلمانوں کے فائدہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی آسان، سلیس اور عام فہم زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ پر کام شروع ہوا جس کی تکمیل "آسان ترجمہ قرآن" پر ہوئی۔ بعدازاں لوگوں کی طرف سے یہ اصرار بڑھا کہ آسان ترجمہ قرآن کے بعد تفسیر پر بھی کام ہونا چاہیے جو جدید زمانہ سے ہم آہنگ اور عام لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے آسان اور عام فہم ہوتا کہ یہ طبقہ فہمِ قرآن کی طرف راغب ہو۔ مستقل تفسیر لکھنے کے لیے شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی اپنے والد گرامی مفتی محمد شفیع عثمانی کی طرح کسی طور رضا مند نہیں ہو رہے تھے بلکہ اگر باپ بیٹے دونوں کے تفسیری پیش لفظ کا مطالعہ کیا جائے تو کسرنفسی کے ملتے جُلتے الفاظ اور عبارات ملیں گے، جس میں ہر دو حضرات اپنی تہی دامنی کا یکساں اعتراف کرتے ہوئے لوگوں کے اصرار اور تائیدِ خداوندی سے یہ مبارک کام کے آغاز کا تذکرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آسان ترجمہ قرآن کے بعد قریبی احباب

کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ موجودہ دور میں سمعی و بصری آلات کے ذریعہ دیکھی اور سنی جانے والی چیزیں زود اثر ثابت ہوتی ہے نیز لوگوں کا رجحان پڑھنے سے زیادہ سننے اور دیکھنے کی جانب بڑھ رہا ہے، ساتھ ہی سفر میں آڈیو ریکارڈنگ سے مستفید ہونے کا چلن بھی عام ہے، چنانچہ تفسیر کے سلسلہ میں آڈیو ریکارڈنگ کی تجویز پر مفتی صاحب نے بطور تجربہ ریکارڈنگ کا آغاز کیا۔ ریکارڈنگ کے دوران ایک نیاز مند کی جانب سے اصرار کیا گیا کہ ان دروس کو ضبطِ تحریر میں لانا چاہیے تاکہ استفادہ عام ہوجائے لیکن اس کے لیے خطابی انداز مستقل تصنیف و تالیف کی راہ میں رکاوٹ رہا، اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے ہمارے عزیز دوست مفتی راشد حسین نے خطابی دروس کو مستقل تصنیفی ڈھب پر لانے کا بیڑا اٹھایا جس میں وہ کامیابی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ اب تک سورۃ الانفال تک کی ریکارڈنگ مکمل ہوچکی ہے جبکہ دو جلدوں پر مشتمل مکمل سورۃ البقرۃ کی تفسیر "آسان تفسیر قرآن" کے نام سے منصۂ شہود پر آکر اہلِ علم سے دادِ تحسین وصول کرچکی ہے۔ حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ جس برخوردار نے والد کی علالت کے دوران تعمیلِ حکم میں انہی کے انداز میں چند سورتوں پر کام کیا، ان کی دعاؤں اور توجہات کی بدولت خداوندِ قدوس نے ایسی مشابہت و مماثلت نصیب فرمائی کہ "معارف القرآن" کی ابتدا بھی ریکارڈنگ سے ہوئی اور اختتام مستقل تصنیف پر، اسی طرح "آسان تفسیر قرآن" کا آغاز بھی ریکارڈنگ سے ہوا اور اب یہ بھی بحمد اللہ ایک مستقل تفسیر کی شکل اختیار کرچکی ہے۔

مفتی محمد تقی عثمانی کی آسان تفسیر قرآن ظاہری و باطنی خصوصیات کا مرقع ہے، یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس تفسیر پر کام کرنے والے مدرّس موصوف سے لے کر ناشر اور جلد ساز تک ہر ایک دلچسپی اور لگن سے اس کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پوری تفسیر میں کوئی بھی ثقیل اور مشکل لفظ موجود نہیں، موجودہ زمانہ کے اعتبار سے اگر کہیں نسبتاً مشکل لفظ لانا پڑا تو حاشیہ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، اسی طرح تفاسیر کے مزاج کی رعایت میں تمام قسم کے اصولی، کلامی اور عقائد پر مشتمل مباحث کو بھی آسان اور عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی عنوانات میں اس

امر کا خیال رکھا گیا ہے کہ وہ زوداثر اور ذیلی مباحث کے نمائندہ الفاظ پر مشتمل ہوں جہاں ایک طرف عنوانات پڑھتے ہی مباحث کا خلاصہ سمجھ میں آجائے اور دوسری جانب قاری کی تشنگی کا مداوا "ھل من مزید" سے ہوتا رہے۔

آسان تفسیر قرآن کے مؤلف موصوف مفتی صاحب قدیم وجدید علوم کی جامع شخصیت ہیں، فقہ و فتوی اور تدریس وقضا سے ان کا تعلق رہا ہے، دنیا دیکھے ہوئے ہیں، لوگوں کی نفسیات اور ان کے ذہن میں پیدا ہونے والے ممکنہ سوالات نیز معاشرے میں پنپنے والے شکوک وشبہات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ عقائد کے باب میں بڑے غیر محسوس انداز میں ان تمام ممکنہ شبہات اور مزعومہ اشکالات کا جواب دیا گیا ہے۔ اسی طرح پوری تفسیر میں نہ صرف عملی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے بلکہ اس پر تفصیلی بات بھی کی گئی ہے۔ کئی اہم مباحث کے شروع میں ایسی جاندار تمہید باندھی گئی ہے جس سے تمام جزئیات وفروعات کا سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں آیاتِ ربوا کے ذیل میں سود، انفاق کے ذیل میں صدقات اور آیاتِ نکاح وطلاق کے ذیل میں عائلی زندگی پر ایسی جامع و مانع بحث کی گئی ہے جو بجائے خود ایک مستقل رسالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح جابجا قرآن کریم کا بنیادی پیغام مختلف انداز سے پیش کیا گیا ہے، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصدِ بعثت پر بھی مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ مقاصدِ بعثت سے عدالتِ صحابہ پر نہایت خوبصورت استدلال کیا گیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

اردو تفاسیر میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ پہلے آیت، پھر ترجمہ اور صرف تشریح طلب آیات میں ذیلی مباحث مذکور ہوتے ہیں جبکہ مذکورہ تفسیر کی ایک اہم اور بنیادی خصوصیت یہ رہی کہ ہر آیت کا ترجمہ اور ہر آیت کے ہر ہر جزو کی تشریح عربی تفاسیر بالخصوص تفسیرِ جلالین کی طرز پر چل رہی ہے۔ مثلاً "وکان اللہ علیما حکیما" اور "واللہ عزیز حکیم" کی بھی تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ علم و حکمت والے کیوں ہیں اور عزیز وحکیم کیونکر ہیں۔ یہ ساری تگ ودو اس لیے کی گئی تا کہ عربی سے نابلد عام آدمی آسانی سے منشائے قرآنی کو سمجھ سکے۔ اسی طرح احادیث اور واقعات کی تخریج کا بھی بھرپور اہتمام کیا گیا ہے تا کہ اہلِ علم کو بھی اصل مآخذ کی طرف رجوع میں آسانی ہو۔

مذکورہ باطنی خصوصیات کے علاوہ تفسیر کو خوبصورت، دیدہ زیب اور خوشنما بنانے کے لیے ظاہری خصوصیات پر بھی بڑی محنت کی گئی ہے چنانچہ دینی کتابوں کی مروّجہ روایات سے ہٹ کر کئی حوالوں سے جدّت اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دو رنگوں کا استعمال بڑے توازن اور تناسب سے کیا گیا ہے، اسی طرح چھوٹے چھوٹے پیراگراف، لائنوں اور لفظوں کے درمیان مناسب فاصلہ، ہر بحث عنوان کے تحت اور ہر صفحہ پر مناسب وقفے اور ایک دو عنوان ہونے کے سبب قاری کو بوریت محسوس نہیں ہوتی۔ نیز تحریر کے جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سی اہم باتیں خانوں اور نمبرات و نکات کی صورت میں واضح کی گئیں ہیں تاکہ پڑھنے میں سہولت ہو۔ اسی طرح تفسیر کی جلد بندی میں بھی ایک خاص معیار کا خیال رکھا گیا ہے، آسان ترجمہ قرآن کی طرح آسان تفسیر قرآن کی بھی دونوں جلدوں کو یکجا کیا جاسکتا تھا، تاہم یکجا کرنے کی صورت میں جلد پر بھی خاصا فرق پڑتا، عام آدمی کو اٹھانے اور پڑھنے میں بوجھ اور دقت محسوس ہوتی، مزید برآں لفظوں کا وجودی ازدحام اس قدر ہوتا کہ طبعِ سلیم پر یہ سب گراں گزرتی۔

یہ تو تھیں تفسیر کی ظاہری و باطنی خصوصیات کی ایک جھلک، جس کا صحیح طور پر اندازہ کتاب کے لمس کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ تفسیر اپنی تمام تر خصوصیات کے باوصف ہم سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم سب سے پہلے تو اس گراں مایہ تحفہ کو روزانہ کی بنیاد پر اپنے مطالعہ میں رکھیں۔ ایک رکوع نہ سہی، کم از کم ایک آیت تو روزانہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر پڑھیں اور اس پر عمل بھی ہو کیونکہ مذکورہ تفسیر نے ہمارے تمام تر اعذار کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے اور ہمارے لیے ایسی سہولت پیدا کر دی ہیں کہ جن کے سبب ہم منشائے قرآنی کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ خود پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے دوست، احباب اور متعلقین کو بھی اس تفسیر کی طرف راغب کرنا چاہیے تاکہ قرآن کی دعوت عام ہو اور معاشرے میں روز افزوں پنپتی بے چینیوں کا مداوا بھی ہو سکے۔ بقولِ اقبال:

قُرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

☆......☆......☆

مرے نام آتے ہیں

آتی ہی رہے گی ترے انفاس کی خوشبو

[مولانا محمد جابر بن مولانا عمر مظاہری پالن پوری، استاذ جامعہ قاسمیہ عربیہ کھروڈ بھروچ، گجرات، انڈیا]

جناب مولانا محمد بشارت نواز صاحب زید فضلہ کا شکر گزار ہوں کہ ان کی کرم فرمائی سے بندے کو ماہنامہ "النخیل" کا چوتھا برقی شمارہ موصول ہوا......الحمدللہ پڑھا......اور شوق سے پڑھا...... ماشاءاللہ ہر مضمون معیاری ہے......علمی و ادبی، دعوتی وفکری اور اصلاحی و تربیتی رنگ میں رنگا ہوا ہے...... بالخصوص بانی رسالہ حضرت مولانا ابن الحسن عباسی رحمہ اللہ کے فرزندِ ارجمند مکرمی سعود الحسن عباسی کا مضمون پڑھا تو بے اختیار ہو گیا......آنکھیں بہہ پڑیں......اور رہ رہ کر مرحوم یاد آنے لگے......اور زبانِ دل سے یہ آرزو اٹھنے لگی......کہ اے کاش! مرحوم اس قدر جلد مسافرانِ آخرت میں شامل نہ ہوتے......اے کاش! آج وہ زندہ ہوتے اور ہم ان کی تحریروں کے منتظر رہتے......!اے کاش

حقیقت یہ ہے کہ اگر آج مرحوم ہوتے تو علم وادب اور تحقیق کی دنیا انہیں دیکھ کر قحط الرجال کے ہولناک تصور میں کمی محسوس کرتی......ان کی علمی تحقیقات وادبی نگارشات سے سیراب ہوتی......اور ان کے قلم کی جولانیاں دیکھ کر فرحاں وشاداں ہوتی......لیکن قضاوقدر کے سامنے کس کا بس چل سکتا ہے! وہ چل بسے......اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے......جس پرودگارِ عالم کے دین وشریعت کی اشاعت وترویج، فہم وتفہیم اور دعوت وتبلیغ میں زندگی گزاری اور اپنی قلمی قوت اس راہ میں صرف کی، اس مالک کے دربار میں پہنچ چکے......اور ان شاءاللہ ان سے پروانۂ رضا وخوشنودی حاصل کر چکے!

گرچہ آج حضرت مولانا مرحوم ہم میں نہیں ہیں......مگر بے شمار بادہ خوارانِ مے کدۂ عباسی کی

رگوں میں وہ خون بن کر وہ دوڑ رہے ہیں......اور ان شاء اللہ وہ اپنی بیش قیمت کتابوں، علمی و ادبی تحریروں، تحقیقی کارناموں اور اپنا جاری کردہ مقبول ترین اور شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے ماہنامہ "النخیل" کی وجہ سے ہمیشہ جہانِ علم وادب میں زندہ و پائندہ رہیں گے ؎

آتی ہی رہے گی ترے انفاس کی خوشبو
گلشن تری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ آج دنیائے علم وادب میں بے شمار رسائل وجرائد اور مجلّات ہیں...... ہر ماہ اس قدر مجلّات شائع ہوتے ہیں کہ ان کو شمار کرنا بھی کارے دارد......لیکن مجلّات کی دنیا میں ماہنامہ "النخیل" اپنی امتیازی شان رکھتا ہے......اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بانی "النخیل" بھی خود گوہر بار قلم کے حامل تھے......صاحب طرز ادیب تھے......قلم پر بہت ہی مضبوط گرفت تھی ......اس پر مستزاد زبردست رجال ساز تھے......اور ماشاء اللہ رجال سازی بھی کیسی فرمائی کہ "النخیل" کو مولانا محمد شفیع جیسے مدیر اور محمد بشارت نواز جیسے نائب مدیر مہیا ہو گئے! یہی وجہ ہے کہ بانی محترم کی رحلت سے الحمد للہ یہ رسالہ نہ تو یتیم ہوا اور نہ رسالہ کے وقار پر حرف آیا......! پھیکا پن ضرور محسوس ہوا ہوگا لیکن اس کے باوجود بھی بہت ہی دلچسپ، دلآویز، معلومات افزا اور علم وادب کا مرقع ہے...... اللہ تعالیٰ سدا النخیل کی صدا بلند و بالا رکھے......آمین!

محمد جابر بن عمر مظاہری پالن پوری
خادم تدریس جامعہ قاسمیہ عربیہ کھروڈ بھروچ گجرات انڈیا
۱۶/رجب المرجب ۱۴۴۳ھ
۱۸/فروری ۲۰۲۲ء
بروز جمعہ



مسافرانِ آخرت

مفسرِ قرآن مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ

نامور ادیب و محقق، مفسرِ قرآن حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ طویل علالت کے بعد ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۳ھ بمطابق ۲۳ جنوری ۲۰۲۲ء کو انتقال فرما گئے۔ آپ کی پیدائش یوپی (ہندوستان) کے قصبہ سنبھل میں ۱۵ مارچ ۱۹۲۶ء کو ایک عظیم علمی خانوادے میں ہوئی۔ آپ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، آپ کے ہم درس ساتھیوں میں مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا محمد اسعد مدنی، مولانا سلیم اللہ خان رحہم اللہ اور مولانا محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم معروف ہیں۔ آپ کے اساتذہ میں نمایاں نام شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ کی علمی و قلمی سرگرمیوں کا آغاز ماہنامہ الفرقان سے ہوا، تو اپنے والدِ ماجد بانی الفرقان مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے شانہ بشانہ الفرقان کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا، آپ طویل عرصہ اس کے ایڈیٹر بھی رہے، ملی مسائل پر آپ کے مضامین ملک بھر میں پڑھے جاتے، آپ کے طرزِ نگارش سے رشید حسن خان سمیت بڑے بڑے ادبا متأثر تھے، آپ کی زندگی دعوتِ دین کی فکر اور اس کی خدمت میں گذری۔ آپ کا آخری اور بڑا تصنیفی کارنامہ چھ جلدوں پر مشتمل "تفسیر محفل قرآن" ہے، یہ تفسیر مکمل ہوجاتی تو عصر حاضر کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوتی۔ آپ نے اپنے چھوٹے بھائی حفیظ نعمانی مرحوم کے ساتھ مل کر ایک اخبار "ہفت روزہ ندائے ملت" بھی جاری کیا، جس کے سرپرست مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ تھے۔ ۸۰ء کی دہائی میں صحت خراب ہوئی تو ڈاکٹروں کے مشورے سے برطانیہ چلے گئے۔ کچھ عرصہ پہلے شدید علالت کے باعث اپنے صاحب زادے کے ہاں دہلی تشریف لائے اور یہیں انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

دو سال قبل ماہنامہ النخیل کے "مطالعہ نمبر" میں مضمون کے لیے مولانا احمد الیاس نعمانی صاحب کے واسطے سے آپ کی خدمت میں بھی خط بھیجا گیا لیکن شدید علالت کے باعث آپ مضمون نہ لکھ پائے۔

کتب نما

قرآنی معارف ومضامین کا نیا علمی تحفہ "تلخیص البیان"

[ماہنامہ النخیل میں کتابوں پر تبصروں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے، النخیل میں کتاب کے موضوع کے اعتبار سے ماہر فن مبصرین سے تبصرے لکھوائے جاتے ہیں۔ تبصرے کے لیے کتابیں "ادارہ تراث الادب" کے پتے پر بھیجی جائیں۔ ادارہ]

نام کتاب	:	تلخیص البیان
مصنف	:	مولانا محمد زاہد انور صاحب
ملنے کا پتا	:	جامعہ عثمانیہ، شورکوٹ، ضلع جھنگ (03327236793)
مبصر	:	مولانا عبدالرحیم۔ شورکوٹ

حضرت مولانا محمد زاہد انور دامت برکاتہم العالیہ نے مقدمہ تلخیص البیان میں حامی عبیدی مرحوم کے مخصوص تجزیاتی اقتباس کو نقل کرتے ہوئے کیا خوب لکھا ہے:

"آج کی سچائی یہ ہے کہ اب شخصیات پرستی کا زمانہ بیت چکا ہے، وقت نے اپنے انداز بدل لیے ہیں، تاریخ کا تیز رو دھارا اب شخصیات کی سمت سے مڑ کر اجتماعیت، ملک وملت اور انسانیت کے لیے رواں دواں ہے۔ تاریخ کے (فکری) اسلوب بدل گئے ہیں، اب کوئی انسان عظیم نہیں ہے اور کوئی ہستی ضروری نہیں، نظریاتِ حق، قوم اور اجتماعیت سب کچھ ہے معاشرہ اور جماعت کو اولیت حاصل ہے "کوئی بڑا آدمی" اس لیے بڑا نہیں کہ وہ بڑے خاندان کا فرد یا کسی بڑے باپ کا بیٹا ہے، تاریخ (اور وقت) اس کے بڑے پن کے لیے خدمات اور کارنامے طلب کرتی ہے۔ اس پس منظر میں ہمیں شعوری طور پر بعض حقائق کا ادراک کرتے ہوئے بہت سارے انتہائی قابل توجہ اور سنجیدہ فکر سوالات کا سامنا کرنا

ہے جس سے فقط اس واسطے دامن نہیں چھڑایا جاسکتا کہ ہمیں ان کی طرف دھیان دینے کے لیے وقت دستیاب نہیں۔"

مندرجہ بالا حقیقت کی روشنی میں اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ اپنے مطالعاتی رویہ کا جائزہ لیں تو علمی و معلوماتی قیمتی افکار کا حاصل پس منظر میں جارہا ہے۔ معروف شخصیات کا نام دیکھتے ہی کتاب خرید کر پڑھے بغیر الماری (لائبریری) کی زینت بنانے کی روش عام ہورہی ہے۔ نئی نسل کی اس علمی بے قدری اور بے اعتنائی پر احتجاج کرنا تو بنتا ہے تاہم سرِ دست ایک انتہائی وقیع نئی علمی معلوماتی تصنیف "تلخیص البیان فی فہم القرآن" کی علمی دنیا میں آمد کو خوش آمدید کہتے ہوئے اہل علم اور صاحبِ مطالعہ حضرات کو اس کے بعض اہم حقائق سے آگاہ کرنا پیش نظر ہے۔

حضرت مولانا محمد زاہد انور مدظلہ ایک اہم معروف دینی ادارہ جامعہ عثمانیہ شورکوٹ کے مہتمم تو ہیں ہی بنیادی طور پر وہ ایک کامیاب، بہترین مدرس ہیں جنہیں کسی موقف کو مدلل طرز سے سمجھانے کا ملکہ اور خداداد صلاحیت حاصل ہے۔ حضرت کا ذوقِ خاص شروع ہی سے تفسیر قرآن رہا ہے، اس کا پس منظر بھی حضرت لاہوری قدس اللہ سرہٗ کے جانشین ولی کامل حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی صحبتِ فیض سے حاصل شدہ وہ جذبہ فکر ہے جو بطورِ خاص قرآنی خدمت کے روحانی ثمرات صالحہ کا صدقہ جاریہ کہا جاسکتا ہے۔ حضرت طبعاً ایک گوشہ نشین اور گمنام مزاج کے حامل ہیں مگر نظریاتی اعتبار سے اپنے اکابر و اسلاف کے اس مقدس فکر کے حدّی خاں ہیں جو قرآن کریم کو بطورِ جامع نظامِ الٰہی اور کامل دستور العمل کے متعارف کرانے کا داعی چلا آرہا ہے۔ وہ عصر حاضر میں اسلامی نظامِ حیات کو قرآنی علوم ومعارف کے ذریعہ آگے بڑھانے کا دردِ دل رکھتے ہیں (جو وقت کا اہم تقاضا ہی نہیں بلکہ چیلنج ہے) وہ مدارس میں قرآنی علوم کی معرفت شعوری غفلت و بے اعتنائی پر شکوہ زن ہیں کہ کیونکر اشرف العلوم (تفسیر قرآن) کے موضوع پر ہماری فکری و عملی بے قدری تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ اس حوالہ سے خواہ ہم جتنی مرضی تاویلات کرلیں لیکن حقیقت سے نظریں چرائی نہیں جاسکتیں۔

تلخیص البیان کا مقدمہ بعنوان "آہ فکر و نظر" اور متصلاً اگلا عنوان "ترجمہ وتفسیر اور بقیہ اہم اسباق کے متعلق چند ناگزیر حقائق کی طرف اصلاحی توجہ" والا مضمون توجہ دلاؤ عرضداشت پر مبنی بطورِ خاص

مطالعاتی تنبیہی فکر کے نشاندہی کا عکاس ہے جو ہر صاحبِ مطالعہ اور اہل علم کی توجہ کو اپنی طرف لازمی مبذول کراتا ہے۔اس قیمتی علمی تحفہ کو تین اہم حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔خوش آئند امر یہ ہے کہ امام الاولیا حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس اللہ سرہٗ کا انتہائی آسان فہم ترجمہ "قرآن عزیز" اس کا جزو خاص ہے جس کا اشتیاق طویل عرصے سے اہل علم کو تھا۔بحمد اللہ تلخیص البیان کے ذریعے حضرت امام لاہوری نور اللہ مرقدہٗ کے بابرکت ترجمہ کی اشاعت سے ہر اہل علم کو استفادے کا بہترین موقع میسر آ گیا ہے۔

۲۔قرآن مجید کی ہر آیت کا خلاصہ مفہوم انتہائی آسان فہم طرز سے بمطابق آیت نمبر بیان کیا گیا ہے جو ایک نیا اسلوب بیان ہے جس سے ہر مدرس خصوصاً درس قرآن دینے والے کے لیے اس قدر آسانی ہوگئی ہے کہ وہ دوران تدریس یا بیانِ عوام وخواص کو بتا سکتا ہے کہ اگلی آیت کا مفہوم، خلاصہ یا منشائے کلام الٰہی کیا ہے۔

۳۔اس قرآنی منفرد علمی تحفے کی ایک خاص انقلابی خدمت مولانا محمد زاہد انور مدظلہ العالی کے نصیبے میں آئی ہے کہ انہوں نے منتخب مضامین کا نادر خزانہ ایسے جدید عنوانات سے متعارف کروایا ہے جس کا رواج ہمارے علمی حلقوں خاص طور پر مدارس میں نہیں۔حالانکہ ان سے آگاہی ہر عالم وطالب کے لیے ازحد ضروری ہے، ۱۰۱ منتخب مضامین (نئے ایڈیشن میں اس کی تعداد ۱۱۰ ہوگئی ہے) کی اکثریت عصر حاضر کے اشکالات، جدید افکار باطلہ کی مدلل مگر آسان فہم طرز سے تردید نیز اکابر واسلاف کے پسند کردہ معتدل اسلوبِ بیان کو ایسے نئی جہت سے متعارف کرانے میں کامیاب رہے ہیں جس کا رواج اب مفقود ہوتا جارہا ہے۔

منتخب مضامین میں سے چند اہم عصری مضامین کی نشاندہی سپرد التفات کی جارہی ہے، امید ہے کہ اہل علم کو ان مضامین کی قدرے تفصیل پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوگی۔صداقت قرآن کا ابدی چیلنج، عملیات جادو مسمریزم کی حقیقت نظریاتی وتہذیبی تصادم سے فکری نتائج، اسلام کا نظام قصاص، حقوق نسواں، عالمی معاشی وباء (مسئلہ ربو)، معاملات کے لین دین کا قانونی نظام، بین المذاہب مکالمہ، فرقہ واریت کی اصولی بحث، اسلام کا نظامِ میراث و وصیت، اسلام کا نظامِ تجارت، اسلام کا

نظامِ معیشت، اسلام کا نظامِ محنت، اسلام اور تصورِ غلامی، وکالت صحیحہ وباطلہ، اسلام کا نظامِ عدل و انصاف مع نظامِ شہادت، حیران یکدم سائنسی ترقی پر اٹھتا ہوا سوال، مشروط امن معاہدے اور اسلام کی دفاعی وخارجہ پالیسی، جامعیت قرآن کی ہمہ جہتی حقیقت، اسلام کا اخلاقی نظام، اختلافِ رائے اور آزادی رائے، عصمتِ انبیاء علیہم السلام، اعتماد اور تقلید محمود، حکومتِ الٰہیہ کی جدوجہد، عقلیات کے بے لگام سائنسی گھوڑے، اسلام، عقل اور سائنس، اسوۂ حسنہ اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصل مفہوم، اسلام اور حقوق العباد، رؤیت ہلال کے حوالہ سے اسلامی نظریہ، حقائق حق کا تاریخ سے موازنہ چہ معنی دارد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کل ۱۱۰ (نئے آمدہ ایڈیشن کی تعداد)۔

منتخب مضامین قرآن کی خاص بات یہ ہے کہ یہ سب زیر مطالعہ آیات قرآنیہ استنباطی فکر سے مرتب کیے گئے ہیں، جو عام طور پر ہمیں دستیاب نہیں۔

حضرت کے اس کام سے قرآن کریم کو بطورِ جامع نظامِ الٰہی متعارف کرانے میں بہت آسانی سے قرآنی آیات کا ایک وسیع ذخیرہ ہاتھ آ گیا ہے۔ اس کے علاوہ امام الاولیا حضرت لاہوریؒ کے بیان کردہ مضامینِ قرآن جن کی تعداد ۱۷۰ سے زائد ہے، کے ساتھ ۲۷۵ مزید مضامین وعنوانات کی بحوالہ آیاتِ قرآنیہ نشاندہی ایک خاصے کی چیز ہے۔ نیز پورے قرآن مجید کے اہم مضامین کا مستقل الگ سے مختصر تذکرہ بعنوان "کوئی حد ہے قرآنی معارف وعلمی خزائن کی" دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اہم معلوماتی تحفہ بعنوان "تحقیق محمودؒ از افاداتِ محمودؒ" کے عنوان سے مفکر اسلام حضرت مفتی محمودؒ کے قیمتی تفسیری افادات کا منتخب مجموعہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے جس میں علم تفسیر کا اہم ترین موضوع شانِ نزول، ربط آیات اور ناسخ منسوخ کی نادر بحث دیکھنے کو ملتی ہے۔ الغرض یہ اہم علمی گراں قدر قرآنی خدمت (تلخیص البیان) اہل علم اور صاحبِ مطالعہ حضرات کے لیے علمی بہار اور وقیع معلوماتی خزانہ ہے جو مدرسین مع عالمات فاضلات اور طلباء وطالبات اور ہر صاحبِ مطالعہ کے لیے بہترین راہنما کتاب مرتب ہوگئی ہے۔ نیز مساجد میں روزمرہ درس قرآن دینے والے حضرات یا تراویح میں خلاصہ مفہوم آیات بیان کرنے والے اہل علم کے لیے مختصر ترین مرتب شدہ علمی گلدستہ ہے۔

☆......☆......☆

مسافرانِ آخرت

پروفیسر ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ

اردو کے نامور ادیب و نقاد پروفیسر ہارون الرشید ۲۲ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۳ھ بمطابق ۲۶ جنوری ۲۰۲۲ءکوانتہائی مختصرعلالت کے بعد وفات پاگئے۔آپ کی پیدائش ۳ جولائی ۱۹۳۷ءکو یوپی کے ضلع غازی پور میں ہوئی۔ تقسیمِ ہند کے بعد آپ والدین کے ہمراہ مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلہ دیش) منتقل ہو گئے جہاں آپ ایم اے اردو کرنے کے بعد درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوئے، بعدازاں کراچی منتقل ہوئے تواسی شعبے سے منسلک رہے، یہاں تک کہ ریٹائرڈ ہوئے۔

پروفیسر ہارون الرشید صاحب بہت بااصول، منکسر المزاج اور بااخلاق شخصیت تھے،سفید نورانی چہرہ،خوبصورت سفید گھنی داڑھی اور لمبے بال اس نورانیت میں مزید اضافہ کرتے تھے۔آپ کے ہاں ہراتوار علم وادب کی ایک مجلس سجتی تھی، جس میں کئی لوگ باقاعدگی سے شریک ہوتے،آپ اردو زبان و ادب کے خاموش خدمت گزار تھے۔موجودہ دور میں اردو کے اسلامی ادب کے نمائندہ ادیبوں میں سے ایک تھے۔آپ کثیر التصانیف اور کثیر الجہات شخصیت تھےاور آپ کاقلم وقرطاس سے رشتہ تادم واپسی برقرار رہا۔اب تک آپ کی ۳۵ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں اُردو ادب (تاریخ و تنقید) کی نو، دبستانِ مشرق پر چار، ذہنی اور فکری جائزوں کی نو، شاعری کی چھ اور ایک خودنوشت "زندگی نامہ" کتابیں شامل ہیں۔جن میں "اردو دینی ادب"، "اسلامی ادب" اور "محفل جو اجڑ گئی" معروف ہیں۔آپ کی کتاب "اردو ادب اور اسلام-تنقید و تاریخ" دو جلدوں میں ۱۹۶۸ءاور ۱۹۷۰ء میں اسلامک پبلیکیشنز لاہور سے شائع ہوئی، اس کے متعلق مولانا عبدالمتین منیری لکھتے ہیں:

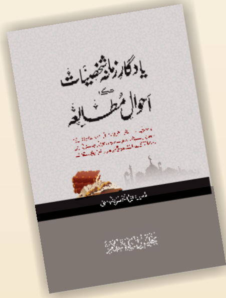
> "یہ کتاب اردو میں اسلامی ادب کے تعارف میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اسے ہر اردو داں صاحبِ ذوق کو پڑھنا چاہیے، مدت گزرنے کے بعد اب بھی اسے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔"

آپ کے پسماندگان میں اہلیہ، چار بیٹے اور چار بیٹیاں شامل ہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ناقابلِ فراموش تحریروں کا سدا بہار مجموعہ

یادگارِ زمانہ شخصیات کا احوالِ مُطالعہ

(اکابر علماء کی نظر میں)



یہ معلوم ہو کر خوشی ہو رہی ہے کہ محترم مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مجلہ النخیل کا ''مطالعہ نمبر'' شائع فرما رہے ہیں، جس میں برصغیر کے مشہور اہلِ قلم حضرات کے ذوقِ مطالعہ و کتب بینی اور انتخابِ کتب وغیرہ سے متعلق وقیع اور گراں قدر معلومات جمع کی گئی ہیں۔ مولانا محترم کی یہ کوشش لائقِ ستائش اور قابلِ قدر ہے۔ امید ہے کہ یہ خصوصی شمارہ ایک قیمتی دستاویز اور نئی نسل کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

مفتی ابوالقاسم نعمانی
مہتمم دارالعلوم دیوبند

''یادگارِ زمانہ علمی شخصیات کا احوالِ مطالعہ'' کے عنوان سے (یہ مجموعہ) شائع کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے۔ امید ہے کہ ڈیجیٹل دنیا کے اس دور میں طلبہ کے لیے یہ علمی کاوش نہایت مفید ہوگی اور مطالعہ کے ختم ہوتے ذوق میں روح پھونکنے کا کام کرے گی۔ ان شاءاللہ۔۔۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے نامور و ماہر ادیب، صاحبِ قلم مولانا ابن الحسن عباسی اور ان کے رفیقِ خاص مولانا بشارت نواز اور دیگر رفقا کو کہ اس کام کو وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے انہوں نے کامیاب کوشش کی ہے۔

مولانا غلام محمد وستانوی
رئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

''النخیل'' کا ''مطالعہ نمبر'' متقاضی وقت بھی ہے اور ایک نہایت لائقِ قدر و ستائش کاوش بھی۔۔۔ راقم السطور بصمیم قلب بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہے کہ حق تعالیٰ آپ محترم اور جملہ شرکائے کار کی ان مخلصانہ جہود کو بارآور فرمائیں اور اس کے ثمرآور اور متوقع مثبت نتائج سے امت مسلمہ کو بالعموم اور نسل نو کو بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین

مولانا محمد سفیان قاسمی
مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند

مطالعہ سے بیزاری کے ایسے عمومی ماحول میں علم و مطالعہ کی صدا یقیناً سناٹے میں آواز پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را کے مصداق بندہ آپ کی اس متوقع اشاعت کو جرسِ کارواں کے طور پر دیکھتا ہے اور دعا گو ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ''النخیل'' کے ''مطالعہ نمبر'' کو قبولیتِ تامہ اور مقبولیتِ عامہ سے سرفراز فرمائے۔

مولانا خالد سیف اللہ گنگوہی نقشبندی
(مدیر) جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

مجھے یہ معلوم ہو کر نہایت مسرت ہوئی کہ آپ اپنے ماہ نامہ ''النخیل'' کا ''مطالعہ نمبر'' منظرِ عام پر لا رہے ہیں، امید ہے کہ آپ کے اس خصوصی دستاویزی اور عالمی و معیاری شمارے سے علم و کتاب سے واسطہ و رابطہ رکھنے والوں کو مزید رہنمائی حاصل ہوگی۔

مولانا محمد سعیدی
ناظم مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

عموماً میدانِ علم کے نو واردان مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ مطالعہ کیسے کریں؟ کیا مطالعہ کریں؟ مطالعہ کرنے کے بعد کچھ یاد نہیں رہتا، اسے ذہن نشین کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ مطالعہ کے بعد لکھنے کا آغاز کیسے کریں؟ تحریر کو مؤثر، شستہ اور رواں کیسے بنائیں؟ تصنیف و تالیف کی مشق کیسے کریں؟ وغیرہ۔ امید ہے، النخیل کی یہ خصوصی اشاعت ان کے ان تمام سوالات اور ان جیسے دیگر بہت سے سوالات کے جوابات فراہم کرے گی۔

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی
سیکریٹری جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی



مجلس تراث الاسلام، سلیم ہاؤسنگ سوسائٹی، شاہ فیصل ٹاؤن نمبر 3، کراچی
فون نمبر: 0300-4097744, 0344-4023470
ای میل: alnakhil786@gmail.com